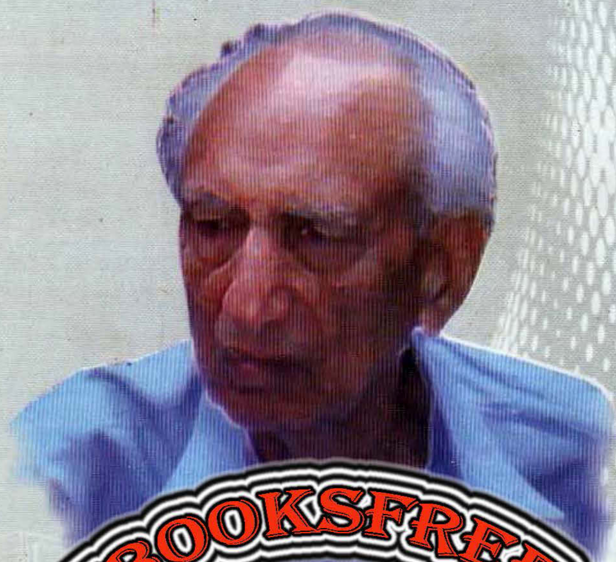
ایک سیاسی کارکن کی

یادداشتیں



رانا محمد اظہر خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

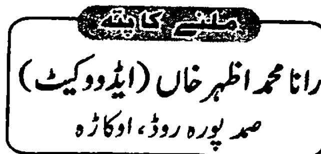
تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



نام کتاب	:	ایک سیاسی کارکن کی یادداشتیں
مصنف	:	رانا محمد اظہر خاں (ایڈووکیٹ)
اشاعت	:	جون ۲۰۱۲ء
پروف ریڈنگ	:	محمد زکریا خان ۳۳۳۔ ایکس، فرید ٹاؤن ساہیوال 0300-6931011
سرورق	:	محمد اختر خان
کمپوزنگ	:	محمد عامر خان 0300-6926533
ناشر	:	انور سنز پبلشرز
مطبع	:	ساہیوال پرنٹنگ پریس پاشا سٹریٹ ساہیوال، فون: 0312-4228333
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۲۵۰ روپے

ISBN: 978-969-9783-01-2





انتساب

محترمہ ہما صفدر

کے نام



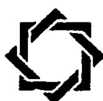


پیش لفظ

Okara Officer's Club میں ''چوگ کسمبڑے دی'' ڈرامہ دیکھنے گیا۔ بلھے شاہ کی کافی کو نجم حسین سید نے ڈرامے کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔ لاہور کی پڑھی لکھی لڑکیوں نے ایک تنظیم بنائی ہے۔ انہوں نے perform کیا۔ Free entry ۔ سٹیج بالکل سادی Modern ،مگر performance بہت ہی پر اثر تھی۔ ڈرامے کے اختتام پر انہوں نے لوگوں سے Comments مانگے۔ مجھ سے بھی پوچھا گیا تو میں نے بھی ان کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہ بہت بہادر لڑکیاں ہیں، جو اپنے حقوق کے لیے مورچہ بنائے ہوئے ہیں۔ لوگوں نے میرا سیاسی تعارف کروایا تو محترمہ ہما صفدر نے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرا انٹرویو کرنے میرے گھر آئیں گی۔ ایک شام شفقت حسین کو ساتھ لیے لاہور سے میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئیں۔ بہت سی کتابیں تحفے میں دیں۔ شفقت صاحب نے بلھے شاہ کا کلام گایا۔ مجھ سے بہت سے سوال کیے اور تصویریں بنائیں۔ اس انٹرویو کو پنچم کے شمارہ مورخہ اگست، ستمبر 2010ء میں چھپوا دیا۔ میری تصویریں اور مجسمے بھی ٹائٹل پر ہیں۔ میں ان کا بہت شکرگزار ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنے تاثرات قلم بند کرنے کے لیے کہا ہے وہ چھاپنا چاہیں گی۔ میں نے اپنے تجربات و تاثرات کو کبھی اتنا اہم نہیں سمجھا کہ چھپوایا

جائے۔ عام کارکن ایسے ہی تجربات سے گزرا ہوگا۔ اگر کوئی اور لکھنے کو کہتا تو میں مذاق اڑائے جانے کی Sense میں لیتا۔ اس دفعہ محترمہ کی Moral Courage کے سامنے سر جھکا دیا ہے اور محمد زکریا خان کی محبت نے لکھنے کا کام مکمل کرادیا ہے۔ اگر اس تحریر کا کوئی فائدہ مند پہلو برآمد ہو تو اس کا سہرا محترمہ کے سرا ہوگا ورنہ کارکن دوستوں سے معافی کا طلب گار ہوں۔

رانا محمد اظہر خاں
(ایڈووکیٹ)
صد پورہ روڈ، اوکاڑہ



میری تاریخ پیدائش 14دسمبر 1934ء بمقام ہریانہ ضلع ہوشیار پور مشرقی پنجاب ہے۔ پاکستان بنا تو مہاجر بن کر اوکاڑہ میں آباد ہوگئے۔ وہاں ہندو مسلم ہائی سکول ہریانہ میں آٹھویں میں تھے۔ دو مہینے کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں پچھلے سال اس سنے دسہرہ کا میلا لگا ہوتا تھا۔ اب کہ قتل و غارت، ٹرکوں میں بیٹھے اجڑ کر پاکستان جارہے تھے جو خوفناک صورت حال تھی وہ یہاں بیان کرنا مقصود نہیں۔ میرے Cousin اور ہم جماعت اعظم خاں نے کہا کہ اظہر ایک بات اچھی بھی ہے کہ مار سے بچ جائیں گے ہم نے سکول کا کام نہیں کیا ہوا۔

یہاں ہمیں نویں کلاس میں داخل کیا گیا(مہاجر بچوں کا سال بچانے کے لیے) یہاں راوی کے لوکل بچوں کی بولی اور ہم ہوشیار پور والوں کی بولی میں بڑا فرق تھا۔ ہمیں اُن کی بولی سمجھ نہیں آتی تھی۔ ہمارے کچھ الفاظ کا مذاق اڑاتے تھے۔ ہم شرمندہ ہوجاتے۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اور دیس بھی انکا۔ آہستہ آہستہ سمجھ آنے لگی تو دوست بننے لگے۔ ایم بی ہائی سکول اوکاڑہ سے 1949ء میں میٹرک کرکے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں F.Sc میں داخلہ لے لیا۔کلاسوں میں بسوں کی طرح Over Loading ہوتی تھی۔ Second Year میں ہوئے تو کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ سارا کالج غم میں ڈوبا ہوا ہال کمرے میں جمع تھا۔ سٹیج پر گورنر عبدالرب نشتر، ڈاکٹر بیگم ایم ڈی تاثیر اور بچے بیٹھے تھے۔

نشتر صاحب نے ڈاکٹر تاثیر کو بہت خراج عقیدت پیش کیا اور بچوں کی مفت تعلیم کے لئے وظیفہ لگایا۔ ڈاکٹر تاثیر بہت زبردست شخصیت کے مالک تھے طالب علم ان سے محبت کرتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں، کریم صاحب، عبدالمجید سالک صاحب، علامہ علاو الدین صدیقی جیسے مشہور اساتذہ وہاں پڑھاتے تھے۔ کالج کی کرکٹ ٹیم میں امتیاز احمد اور خان محمد Player تھے۔ فٹ بال میں بھی کالج مشہور تھا۔ مگر کلبوں کے کھلاڑی کالج میں داخل کر رکھے تھے وہ میچ کھیلتے اور جیت جاتے تھے۔ Sports کے انچارج خواجہ صاحب خوشامد پسند تھے۔ وہ فٹ بال ٹیم کی Selection کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ کالج کی فٹ بال ٹیم کے کپتان شیخ ارشاد کو Punjab University کی ٹیم کے لیے سیلکٹ نہ کیا گیا اور چہیتے عبدالمالک کو یونیورسٹی کی ٹیم میں پہنچا دیا گیا۔ خواجہ صاحب کے ہاتھوں فٹ بال کھیل کو کافی نقصان پہنچا۔ کالج کے پاس مناسب گراؤنڈ ہی نہیں تھی۔ صبح کالج جانے کے لیے گوالمنڈی کی تنگ سڑک اور بھیڑ سے گزرنا پڑتا۔ کالج گیٹ کے سامنے عرب ہوٹل تھا جو دھوئیں سے بھری تنگ جگہ تھی مگر مسلمان دانشوروں کے جمع ہونے کی وجہ سے مشہور تھی۔ B.Sc کرنے کے لیے Govt. College لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہ 1952ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر سراج الدین صاحب پرنسپل تھے۔ خواجہ منظور صاحب اور اشفاق صاحب سے وہاں انگریزی پڑھی۔ پروفیسر اشفاق صاحب مجھے پیار سے لمبو کہہ کر پکارتے تھے۔ صفدر میر صاحب بھی انگریزی پڑھاتے تھے۔ کالج کا ڈرامہ انگریزی زبان میں ہوتا تھا۔ Miss. Koelo, Miss Promella Thomas اداکارہ تھیں۔ درست لہجے میں dialogues بولتی تھیں۔ ہمارے سیکشن کا رزاق ہیرو تھا۔ یونین کے صدر Aslam Azhar

اور Savik Katric تھے۔ Savik Katric انگریزی مادری زبان جیسی روانی سے بولتا تھا۔ کچھ لڑکے Avant Guard (نئی ترکیب) سٹائل میں انگریزی میں افسانے لکھتے اور راوی میں چھپتے۔ راوی کے اردو سیکشن کے انچارج شکور بیدل تھے۔ وہ میرے نانکے راہوں ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے۔ میرے ماموں حمید خاں کے دوست تھے۔ ان کا تعلق موسیقار گھرانے سے تھا، ان کا ایک پنجابی گانا "چن نوں پیار کرن دابلیا ایہو نتیجہ ہوندا اے" اکثر ریڈیو سے سنایا جاتا تھا۔ کالج میں ملے تو فوراً مجھے پہچان کر بولے۔ اس کالج میں داخلہ مل گیا بہت اچھا ہوا۔ عمر میں مجھ سے کافی سال بڑے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایم اے اُردو میں داخلہ لے رکھا ہے۔ راوی کے اردو سیکشن کا انچارج ہوں۔ اگر مجھے دفتر میں کوئی پرابلم ہو تو انہیں بتاؤں۔ کالج کا Displine بہت سخت تھا۔ ڈاکٹر صادق صاحب وائس پرنسپل تھے کوئی طالب علم کلاس کے باہر برآمدے میں ٹھک ٹھک کر کے گزرتا تو 50 روپے جرمانہ کردیتے تھے۔ سب لڑکوں نے Crepsole والے بوٹ لے لیے۔ 1954ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے B.Sc Botany Zoology کرنے کے بعد دوستوں کی پھیلائی ہوئی مایوسی کہ Zoology Botany والوں کو نوکری نہیں ملتی، ابھی تک 3-4 سالوں کے فارغ التحصیل بے روزگار پھرتے ہیں۔ تو یونیورسٹی لاء کالج میں 1955ء میں داخلہ لے لیا۔ پنڈی سازش کیس والے میجر اسحاق گروپ نے بھی سزا کاٹنے کے بعد وہاں داخلہ لے لیا تھا۔ ڈاکٹر قیوم صاحب پرنسپل تھے۔ کلاس فیلو دوست بن گئے میجر اسحاق کے چھوٹے بھائی چوہدری انور Communist Party کے Paid Whole Timer تھے لاہور ہوٹل کے سامنے کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ رانا سخاوت بتایا کرتا تھا کہ 30 روپے کے سگریٹ اور 30

روپے کی روٹی وغیرہ۔ سگریٹ لگا کر کالجوں کے چکر لگانا، میرے دوست مشتاق احمد (بعد میں BDS ڈاکٹر اسلامیہ کالج) کیمسٹری کے پریکٹیکل والے دن ان سے ملاقات ہوتی ۔ بعد میں بھی ان سے ملتا رہا۔

کیپٹن ظفر اللہ پوشنی بہت اچھے Debator تھے۔ ساتھ ہی ان کی شخصیت بہت (Pleasing Personality) پرکشش تھی میں انہیں چاشنی کہتا۔ میجر اسحاق، سیف خالد، رانا سخاوت، ندرت الطاف صاحبہ اور دوسرے دوستوں نے پوشنی صاحب کو یونین کی صدارت کا الیکشن لڑوایا۔ مگر جماتیوں کے پروپیگنڈے اور امریکی پیسے کی وجہ سے ہار گئے۔

LLB پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ عابد حسن منٹو اور سید افضل حیدر کے ساتھ مل کر شیخ عنائت اللہ انارکلی والے کی دوکان کے اوپر چوبارہ میں Legal Practice کا کام کیا۔ مگر مجھے اوکاڑہ جانا پڑا اور اوکاڑہ تحصیل میں بطور وکیل 1961ء میں enrole ہوگیا۔

Joint Family سے علیحدہ ہوکر تین میل دور گاؤں L-52/2 اوکاڑہ میں رہائش اختیار کی۔ کچی سڑک تھی۔ سائیکل پر کچہری آنا جانا شروع کر دیا۔ راوی کے گاؤں والے سائلوں کی بولی سمجھ نہیں آتی تھی۔ لاہور اور مفصل کی عدالتوں کے ماحول میں بڑا فرق ہے۔ یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اچھے تعلیمی ادارے کی تعلیم بڑے کام کی چیز ہے۔ ایسے تنگ ماحول میں گھرنے کے باوجود انسان بد حواس (Confuse) ہوکر سمت (Direction) نہیں بھولتا۔ اس نے ہر طرح کے لوگ دیکھے ہوتے ہیں۔ کامیاب اور اچھے لوگوں کو نزدیک سے دیکھنا ایک اچھی کتاب کی مانند ہے۔ پطرس بخاری کے مضامین تو پڑھے تھے مگر جب بھی UNO سے لاہور آتے تو گورنمنٹ کالج ضرور آتے۔

ہال میں یونین کا صدر سیوک کیٹرک اِن کے ساتھ بیٹھتا اور بخاری صاحب بے تکلف انداز میں طالب علموں سے ملتے۔ تو بہت Confidence ملتا۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب بھی اسی طریقے سے سمجھاتے اور ملتے تھے۔ صوفی تبسم صاحب بھی پیار سے ملتے۔

سعادت حسن منٹو صاحب جب 1953ء میں بزم اردو گورنمنٹ کالج لاہور کی دعوت پر کالج میں تشریف لائے۔ 12:30 بجے ہم پریکٹیکل والے طالب علم ہی رہ جاتے تھے۔ جب کالج کی پڑھائی کا ٹائم ختم ہوا اور اردو والے طالب علم باہر آئے تو لڑکوں نے دیکھا کہ منٹو صاحب آئے ہوئے ہیں۔ ایک طالب علم کرسیاں لے کر آیا۔ بیگم منٹو صاحبہ کرسی پر بیٹھ گئیں، جب کہ منٹو صاحب لڑکوں کے اسرار کے باوجود سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئے۔ اور کہنے لگے میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔ باقی کلاس بھی آ گئی اور محترمہ چاند صاحبہ لیکچرار سائیکالوجی بھی آ گئیں۔ دونوں خواتین کرسیوں پر اور منٹو صاحب سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ طالب علم کھڑے اور باقی ان کے ساتھ بیٹھ گئے، میں بھی۔ ایک طالب علم نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا کہ آپ فحش کیوں لکھتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں منٹو صاحب نے کہا کہ آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ معاشرے میں برائی موجود ہے تو ادب میں بھی اس کی جھلکی نظر آئے گی۔ میرا فرق یہ ہے کہ اُن کی طرح میں یہ نہیں کہتا کہ جب میں نے ہاتھ ڈالا تو میرا ہاتھ سیاہ ہوگیا میں کہتا ہوں میرا ہاتھ سیاہ نہیں ہوا ہاں دل میں سیاہی ضرور آئی ہوگی (''ہاتھ ڈالا'' والے فقرے کی وجہ سے خواتین کی موجودگی میں ذرا Odd صورت حال بن گئی'') منٹو صاحب اپنی بات کو سنجیدگی سے اور بہت خوبصورتی سے بیان کرتے رہے، وہ بات کا مذاق اڑتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ گویا

Evil کا مسئلہ ادب میں ایک اہم مسئلہ ہے۔اس وقت تک ہمارا پریکٹیکل کا ٹائم ہو چکا تھا۔منٹو صاحب ہوسٹل کے سامنے جو چھوٹا سا Open Air سٹیڈیم بنا ہوا ہے، اِس میں نہیں بیٹھے تھے بلکہ اس کے مغرب کی طرف ساتھ ہی کمرے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔بیگم منٹو بڑی بھلی خاتون تھیں وہ دوران گفتگو مسکراتی رہیں۔

اتنے نزدیک سے منٹو صاحب کو ملنے کا واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولا۔ ایسے تجربات ہی انسان کو گرنے سے بچاتے ہیں۔ملتان ڈویژن میں PSI کی اسامیاں نکلیں۔کوالیفائی تو کر لیا مگر وہاں سفارشی رکھے گئے۔وکالت کے پیشہ میں اپنے آپ کو تقریباً Misfit محسوس کرتا تھا۔بس کچہری سے چمٹے رہے مگر وہاں دل نہیں جمتا تھا۔میونسپل کالج اوکاڑہ میں ایک پروفیسر دوست سلیم جاوید ڈرامہ Stage کرواتے تھے۔میں بھی rehearsals دیکھنے جانے لگا۔انہی دنوں محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب کے خلاف الیکشن لڑا۔اوکاڑہ شہر میں صرف دو ہی کارکن تھے جو محترمہ کی Campaign کرتے۔شیخ عنایت اللہ صاحب اور کامریڈ عبدالسلام، لوگ پولیس کے خوف سے بات نہیں کرتے تھے۔میں بھی اپنے گاؤں L-52/2 سے محترمہ کے حق میں B.D کینڈیڈیٹ کھڑا ہوا، مگر مجھے بٹھا دیا گیا۔گاؤں میں آباد ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔انہی دنوں میری بہن کی شادی ہوئی۔چینی کا بحران تھا۔اوکاڑہ میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر شیخ وحید تعینات تھے۔میری اور پروفیسر سلیم جاوید کی دوستی ان سے ہوگئی۔ہماری ملاقات Decent Hotel میں ہوتی۔ان کی شخصیت بہت پرکشش تھی۔تعلیم تو صرف میٹرک تک تھی۔مگر انگریزی کی کتابیں، اخبار اور رسالے بہت پڑھتے تھے۔شکل وصورت بہت خوبصورت تھی۔(فلمی ہیروز سے بہتر) سوچ اور نظریات کے اعتبار سے Marxist تھے۔وہ ہم سے عمر اور تجربے میں

Senior تھے۔ اُنہوں نے کہا رانا! مجھے ایسا لگتا ہے کہ Mao Tse-Tung بھی غدار نکلے گا۔ میں کوئی وجہ یا ثبوت تو نہیں دے سکتا، مگر یاد رکھنا میری بات، ان دنوں ویٹ نام کی جنگ جاری تھی۔ چین بہت اُبھرتا ہوا نام تھا۔ ہر کوئی Mao کے بلے لگائے پھرتا تھا۔ پھر جب 1967ء میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی میں تحصیل اوکاڑہ کا convener تھا اور جنرل سیکرٹری بھی، بہت سرگرم۔ تو ایک دن شیخ صاحب ہوٹل میں آئے اور بتایا کہ کل میں نے ٹیلی ویژن پر ایوب خان کو چائنہ میں جو Reception دی گئی ہے وہ دیکھی۔ یار رانا! وہ تو اس قدر زبردست Reception تھی کہ کسی بھی بڑے سے بڑے آدمی کا سر پھر جائے گا۔ میرا خیال ہے ایوب خان Pro China بن جائے گا۔ پھر ایک دن کہا کہ امریکہ بھٹو کو مرنے نہیں دے گا۔ امریکہ نے دبی سی دھمکی لگائی ہے کہ ایوب خان Opposition کو Crush کرے تو ہم دیکھیں گے۔ امریکہ پاکستان کو China کے دھڑے سے واپس نکال کر امریکی دھڑے میں لانے کے لیے بھٹو کو استعمال کر رہا ہے۔

اس کی Feudal بیک گراؤنڈ ہے۔امریکہ کی طرف ہی جائے گا۔ لیاقت علی وغیرہ کی طرح۔ Socialism کی باتیں Intellectual exercise ہیں۔ دیکھیں گے۔ ہم لوگ جذبے سے بھرے تھے۔ کام کرتے رہے۔ میونسپل کالج اوکاڑہ کے ڈراموں کی ری ہرسل rehearsals کے دوران کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عطا محی الدین صاحب[1] سے متعارف ہوا۔ اوے تسی آئے کیوں نہیں؟ میں انتظار کردا رہیا۔ کھلے ڈلے انسان تھے۔ میں اور ڈاکٹر

1۔ ڈاکٹر عطا محی الدین صاحب نے کیمبرج یونیورسٹی سے تاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھی۔ انہوں نے اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا تھیسس مشہور تاریخ دان لین پول کی زیرنگرانی مکمل کیا۔ وہ 60ء کی دہائی میں میونسپل کالج اوکاڑہ کے پرنسپل رہے۔ جو اب گورنمنٹ کالج اوکاڑہ ہے۔

احمد مصطفیٰ (شورہ کوٹھی والے) ہر روز کچہری سے فارغ ہو کر کالج پہنچ جاتے۔ تاکہ ڈاکٹر صاحب کی England کی یادیں سنیں۔ اُن کی میم بیوی اور بیٹی وہیں تھیں۔ India آنے پر تیار نہ ہوئیں اور انہیں چھوڑ گئیں۔ ڈاکٹر احمد مصطفیٰ بھی یورپ گھوم چکے تھے۔ Pakistan Times کے نمائندہ رہے تھے۔ انتہائی ذہین اور حاضر جواب تھے۔ فوراً لاجواب کردیتے۔ 1926ء کی Dada Movement سے متاثر ہوئے تھے تو ان کی پوری شخصیت ہی Sneer بن گئی۔ کوئی Snob (سنوب) یا اپنے آپ کو Superior ثابت کرنے کی کوشش کرتا تو اس کی بےعزتی کر کے ہی دم لیتے۔ بہت Moral Courage رکھنے والے انسان تھے۔ اتنی پیچیدہ شخصیت کو جاننے کے لیے ضخیم Biography کی ضرورت ہوگی۔ بہرکیف میں، ڈاکٹر احمد مصطفیٰ اور پروفیسر سلیم جاوید، ڈاکٹر عطا محی الدین صاحب کی کالج والی کوٹھی پر اکٹھے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب 80 کے لگ بھگ تھے۔ انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد پرنسپل رکھا گیا تھا۔ اِدھر ہم آئے اُدھر ڈاکٹر صاحب نے عبدالغنی مالی کو اونچی آواز دی۔ ''چاء رکھ دے اور میرا حُقّہ دھر کے لے آ'' بیٹھتے ہی کتاب کا ذکر شروع کردیتے۔ او بھائی رانا! کل میں D.H. Lawrence کی کہانیاں پڑھتا رہا۔ مجھے پرانی یادیں آئیں۔ Lawrence برطانیہ میں میرے نزدیک ہی فلیٹ میں رہتا تھا۔ اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ مگر فلیٹ میں اکٹھے ہی رہ رہے تھے۔ ''یار سلیم! بڑے عجیب لوگ ہیں، یہ ہمیں ان کی سمجھ نہیں آتی'' ڈاکٹر احمد مصطفیٰ نے کہا کہ اس لئے نہیں آتی کہ ہم نے دونوں بڑی جنگیں نہیں دیکھیں۔ وہاں کیا بچ گیا تھا۔ نہ Family رہی نہ آرٹ اور لٹریچر۔ بس انسان یوں ہی ہنستا پھرتا ہے۔ موضوع بدلا تو پرنسپل صاحب نے فرمایا۔ جالندھر ساڈے محلے دی اِک کڑی

سی۔ مینوں لہور ملی تے میں پچھیا۔ کاکی توں کتھے ہندی ایں؟ کہن لگی فلماں وچ کم کردی آں، آشا پوسلے میرا ناں اے۔ کیہ میں اوہنوں کہواں تہاڈے ڈرامے وچ ایک دن پرفارم کرجائے۔ نہیں ڈاکٹر صاحب کوئی ضرورت نہیں۔ سلیم جاوید نے کہا "چھوٹا شہر ہے"۔ اچھا تے پھیر ریڈیو وچ کم کرن والے سلطان کھوسٹ نوں بُلا لواں؟ ہم نے کہا! ہاں وہ ٹھیک ہے۔ سلطان کھوسٹ اوکاڑہ کالج آیا اسکے مزاحیہ پروگرام سے طالب علم اور شہر کے لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ اوکاڑہ کالج کے ڈراموں کے دوران بہت سے لوگوں سے ملنا ہوا۔ Stage Craft کی بھی کچھ سمجھ آئی۔ اُس محلے سے سازندے آئے تو اُن کے ساتھ سرفراز خان منا آئے۔ ڈاکٹر احمد مصطفٰے کلاسیکی موسیقی کی گہرائیوں سے واقف تھے۔ پاکستان سے پہلے انہوں نے بڑے موسیقاروں کو سنا ہوا تھا۔ اس کے لیے ذوق اور کان رکھتے تھے۔ اب ان ڈراموں کی بدولت مجھے اور پروفیسر سلیم جاوید کو کلاسیکی موسیقی کی سمجھ پڑنے لگی۔ گویا ہمارے لیے علم اور لطف کا ایک اور دروازہ کھل گیا ہو۔ برصغیر کی موسیقی بلندیوں کو چھوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کلاسیکل موسیقی کی سوجھ بوجھ پیدا ہوجانا بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ تصوف اور مذہب کو راستے اِدھر ہی سے ہوکر نکلتے ہیں۔ منے خاں اور اعجاز بہت بلند پایہ انسان تھے۔ دل کی خوبیاں اتم درجے موجود تھیں جو فنکار کے لیے بڑا اثاثہ ہوتی ہیں۔ اُستاد عاشق علی پٹیالہ والے کی ترتیب دی ہوئی بھیروں بہار۔ دو راگوں کو ملا کر گاتے (جو بنارے) بڑا سماں بناتے۔ لتا جی کی پہاڑی میں گائی ہوئی دھن "جل کے دل خاک ہوا" اکثر یہی سناتے۔ آنکھیں بھیگ جاتیں۔ سروں پر مکمل عبور تو بہرحال بہت محنت مانگتا ہے ہم راگوں راگنیوں کی شکلیں اور رنگ جان چکے تھے۔ ایک دفعہ رمضان شریف کی رات (Venus) چوک

اوکاڑہ ساری رات کھلا رہتا اور چائے دستیاب رہتی)اعجاز کے چوبارے میں سلیم جاوید، اعجاز اور میں تینوں شریف خان پونچھ والے کی ستار پر بجائی راگ کدارا ٹیپ پر ساری رات سنتے رہے۔ پوری رات بار بار ایک ہی راگ، اعجاز اور منا اب نہیں ہیں۔ پھر ہمارے ہریانہ ضلع ہوشیار پور کے خاں صاحب احمد بخش آ گئے۔ انکا یہاں بڑا دل لگا۔ پاکپتن جانا چاہتے تھے لیکن دو مہینے میرے پاس رہ کر واپس اپنے گھر قبولہ لوٹ گئے۔ وہ دھرپتئے تھے۔ یہاں کوئی پکھاوجی نہیں تھا۔ بوڑھے تو تھے، مگر دل جوان تھا۔گا سکتے تھے۔ اس دوران بہت پُر رونق محفلیں منعقد ہوئیں۔

ہریانہ میں بہت نامور گویئے پیدا ہوئے ہیں۔ خاں صاحب محمد بخش ساری عمر لاہور ریڈیو سے منسلک رہے۔ ان کے بیٹے درس و تدریس کے شعبے میں چلے گئے۔ استاد سلامت علی ہمارا ہم عمر اور دوست تھا۔ اکٹھے چو (ہوشیار پور کے علاقے میں قدرتی ندی نالے بہت تھے اُن کو چو کہتے ہیں)میں کھیلتے تھے۔ دراصل سلامت کے نانکے ہریانہ کے تھے۔ یہیں رہتے تھے۔ شام چوراسی کبھی کبھار جاتے۔ ان کے ماموں احسان خاں اور صادق خاں پانچ، چھ بھائی تھے۔ اچھے گویئے نہیں تھے۔ احسان بہت ذہین مگر جگتئے تھے۔

1962-63ء میں اوکاڑہ کالج کے ڈرامے کے دور کی ہی بات ہے کہ کچہری میں Father Albert جو Italian تھے آیا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک جیپ تھی۔ میری ان سے دوستی ہوگئی۔ میں ان کے گاؤں 6 چک جہاں گرجا تھا بھی جاتا رہا۔ انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے بھی لٹریچر دینا شروع کیا۔ ان کی بدلی ہوگئی میں نے انہیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ میں Jesus Christ کا Admirer بن چکا تھا۔۔ اب بھی ہوں ۔ بہت دیر بعد

ماسٹر لال مسیح جو ٹیچر تھے کے ساتھ مل کر بائبل کو Revise کیا۔

شیخ وحید کی لاہور بدلی ہوگئی۔ ڈاکٹر عطا محی الدین صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ منا اور اعجاز بھی رخصت ہوئے۔ ڈرامے اور موسیقی بھی ختم ہوگئی۔Father Albert کہیں غائب ہوگئے۔ مگر سب دوستوں کی یاد نے تڑپائے رکھا۔ ان لوگوں نے میری سوچ اور رویئے پر اثر کیا۔ Father Albert کے کافی دیر بعد تک میں خلیل جبران پڑھتا رہا۔ ایک رات مجھے Christ خواب میں آیا۔میں نے اُس خواب کے زیر اثر Christ کی تصویر بنائی۔ اب مجھے Marry کی بھی کچھ سمجھ آنے لگی۔ میں ان مذہبی تصویروں کو خوب غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ مجھے دوسری تصویریں بھی سمجھ میں آنے لگیں۔ یہ شوق مجھے پیدائشی تھا۔ نہ کسی نے گائیڈ کیا نہ کوئی کتابیں وغیرہ پڑھی تھیں۔ اپنے طور پر ووڈلنگ کرتا رہتا۔ ایک دفعہ Illustrated Weekly of India میں George Keyt جو سری لنکا کے Painter تھے اور English Language Poet بھی۔ ان کی ڈرائنگ چھپی ہوئی دیکھیں تو فوراً مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ Gray گراؤنڈ پر سیاہ Caligraphic لکیریں۔ مجھے بہت اچھی لگیں۔ مجھے رنگ سمجھ نہیں آتے تھے۔ پیلا رنگ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔صرف سیاہ اچھا لگتا۔شاید میں ذہنی مریض تھا۔ افسردہ طبیعت(Melancholic) ہوسکتا ہے۔ رنگ بہت دیر بعد اچھے لگنے شروع ہوئے۔ ایک ،ایک کرکے امرتا شیر گل کی Mother India اور زین العابدین کی تصویریں بھی Illustrated Weekly میں ہی دیکھیں تھیں۔ گجرال کی بھی Illustrated میں ڈرائنگ دیکھیں۔ستیش گجرال میں اپنے بزرگوں کو میں پہچان سکتا ہوں۔ میں نے بھی ایک تصویر Refugees بنائی تھی۔ ضائع ہوگئی۔

افسوس ہے۔ میرا سب سے بڑا اور گہرا تجربہ یہی ہے۔ اب بھی لوگ مجھے بیتی یادوں کا مارا (Nostalgic) کہتے ہیں۔ مگر اب ہر چیز Conscious Level پر آ گئی ہے۔ شاید کچھ شعوری سطح Conscious پر لانے میں Pra-xis کا رول بھی ہوتا ہے۔ مراد سوشل عمل سے ہے۔

کشمیر کا کیس UNO میں تھا مگر سرد خانے میں چلا گیا تھا۔ اسے اخباروں اور ریڈیو کی خبروں میں لانے کے لیے وہاں مجاہدین کو سرگرم کیا گیا۔ اندرونی مسائل میں مداخلت خیال کرتے ہوئے ہندوستان نے ٹینکوں سے حملہ کرکے دریائے توی کے کنارے جموں کو جانے والی سڑک پر قبضہ کر لیا۔ پاکستانی فوج نے بھی ہیڈ سلیمانکی سیکٹر میں وسیع علاقے اور کھیم کرن شہر پر قبضہ کر لیا۔ 1965ء کی جنگ چھڑ گئی۔ پاکستان ایئر فورس نے عزت کمائی اور میرے پسندیدہ ہیرو رفیق (سکارڈن لیڈر) نے شہادت پائی۔ UNO کی مداخلت سے جنگ کو رکوایا گیا۔ اور فریقین کو تاشقند میں روس کی صدارت میں (کوسیجن کا دورِ صدارت) اس شرط پر صلح کرائی گئی کہ کوئی فریق کسی کے اندرونی مسئلوں میں دخل نہیں دے گا۔ چھینے گئے علاقے واپس کیے گئے۔ پاکستان میں ایوب خان ڈکٹیٹر تھے اور ہندوستان میں شاستری جی وزیرِ اعظم۔ لوگوں نے نعرے لگائے کہ میدان میں جیتی جنگ میز پر ہار دی۔ اس سے قبل محترمہ فاطمہ جناح کو الیکشن میں ہرایا گیا تو بھی لوگوں نے کہا کہ رات کو محترمہ جیت رہی تھیں صبح کو ہرا دیا گیا۔ 1965ء کی جنگ کو ذوالفقار علی بھٹو (وزیرِ خارجہ) کی غلط پالیسی کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ بھٹو نے وزارت چھوڑ دی۔ واپسی پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر بہت لوگ جمع ہو گئے تو بھٹو صاحب نے بہت جذباتی انداز میں کہا کہ وہ بتائیں گے کہ وہاں تاشقند میں کیا ہوا؟ اُن کا آنسوؤں سے بھرا رومال لوگوں نے اٹھا

لیا۔ اخباروں میں خبریں آنے لگیں۔ ہر جگہ بھٹو کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ تاشقند میں ایوب خاں کو بہت خفت اٹھانی پڑی کہ وہ حملہ آور ہیں۔ اور کشمیر ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ (اس پر ہی علاقہ خالی کیا گیا) گویا کشمیر کا مسئلہ ختم ہو گیا۔

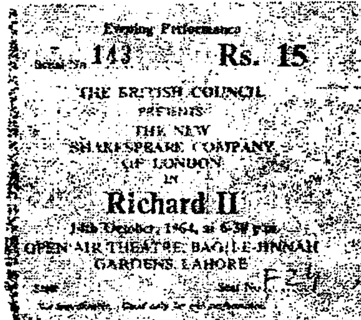
کچھ عرصہ بعد اخبار میں خبر چھپی کہ بھٹو صاحب ایک نئی سیاسی پارٹی بنائیں گے۔ تاریخ کا اعلان عنقریب کیا جائے گا۔ میں نے خط لکھ دیا کہ جب پارٹی سازی کی تاریخ اور جگہ وغیرہ کا فیصلہ ہو جائے تو ہمیں اطلاع دی جائے۔ چند ماہ بعد کنونشن کی تاریخ اور جگہ بارے خط آ گیا۔ میں نے اپنے دل سے طے کر رکھا تھا کہ کنونشن ضرور Attend کرنی ہے۔ دیکھیں گے کیا باتیں ہوتی ہیں۔

میں ان دنوں اوکاڑہ سے 3 میل کے فاصلے پر گاؤں L-52/2 میں رہتا تھا۔ اور وکالت کے سلسلے میں شہر آیا کرتا تھا۔ کنونشن سے ایک دن پہلے شام کو لاہور پہنچا۔ انارکلی بازار میں ایک سستے ہوٹل کا کمرہ لے کر وہاں سو گیا۔ 30 نومبر 1967ء کی صبح نہا دھو کر گلبرگ پہنچ گیا۔ Auriga سینما کے سامنے ایک کوٹھی کے گیٹ پر کنونشن کا کپڑا لگا ہوا تھا۔ سڑک عبور کی اور اندر چلا گیا۔ کوٹھی کے باہر کوئی آدمی نہیں تھا۔ نہ ہی پولیس تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے حکومت کنونشن کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی۔ جیسے غیر اہم فنکشن ہو۔

گیٹ میں داخل ہوا تو میز پر کاغذات اور بلے پمفلٹ سنبھالے ہوئے دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ میرا نام پتہ نوٹ کیا۔ پمفلٹ اور بلاّ دیا اور دو، تین روپے چندہ وصول کیا اور آگے بھیج دیا جہاں لان میں کرسیاں رکھی ہوئیں تھیں۔ جا کر اپنی عادت کے مطابق پچھلی قطار میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ لوگ پہلے سے جمع تھے میرے بعد تھوڑے اور لوگ آئے۔ ڈائس پر کنونشن کے صدر اسلم حیات ایڈووکیٹ بیٹھے تھے۔ میں اسلم حیات صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا کیوں کہ وہ

کافی ہاؤس مال روڈ (Zelin's Cofee House) روزانہ آنے والوں میں سے تھے۔ ان کے Progressive Ideas کا مجھے اس دن ہی پتہ چلا۔ کنونشن کے سٹیج سیکرٹری ملک حامد سرفراز تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی بھاری اور بارعب آواز کے ساتھ سٹیج سے announce کرتے آتے۔ مندوبین اب کچھ ہی دیر میں کارروائی شروع کی جانے والی ہے۔ مندوبین ! تھوڑا انتظار کرلیں۔ اور لوگوں کے آنے کی توقع ہے مندوبین۔۔۔ وغیرہ۔ کوٹھی کے باہر ہر طرح سکون تھا اندر بھی مکمل سکون تھا۔ نہ لاوڈ سپیکر تھا اور نہ لوگوں کا گھومنا پھرنا۔ میں اسلم حیات ایڈووکیٹ کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا تھا۔ میرے ساتھ والی کرسیوں پر تشریف فرما مہمان مجھے بتاتے کہ فلاں ڈاکٹر مبشر ہیں۔ فلاں جے اے رحیم ہیں۔ فلاں سندھ سے رسول بخش ہیں۔ قاضی فضل اللہ ایڈووکیٹ اِن دنوں لاڑکانہ بار کے صدر تھے۔ انہوں نے ڈائس پر آکر تقریر کی۔ بھٹو صاحب کے ساتھی ہونے کا اعلان کیا۔ ان کے لہجے میں مزاحیہ رنگ غالب تھا۔ وہ سندھ میں ایوب خان اور ان کے ساتھیوں کے مزاحیہ خاکے بناتے تھے۔ بھٹو صاحب بھی کوٹھی کے کمرے سے آکر پہلی قطار والی کرسی میں بیٹھ گئے۔ اخباروں کی تصویروں کے علاوہ بھٹو صاحب کو پہلی دفعہ دیکھا۔ اب کونشن کی Opening کا اعلان کیا گیا۔ پورے House نے متفقہ طور پر بھٹو صاحب کو پارٹی کا چیئرمین چننے کا اعلان کیا۔ کنونشن کے چیئرمین اسلم حیات صدارت کی کرسی سے اٹھ کر نیچے مندوبین کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پارٹی بننے کا اعلان ہوگیا۔ بھٹو صاحب چیئرمین بن گئے اور وہ اٹھ کر چیئرمین کی کرسی پر آگئے۔ ہلکی سی تالیوں سے خوش آمدید کہا گیا۔ کھڑے ہوکر تھوڑا وقت لیتے ہوئے ملکی حالات کی مایوس کن صورت حال بیان کی۔ جاگیرداروں کے ظلم کا

ذکر کیا۔ ان سب معاملات کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ اِن کو سیدھے راستے پر چلانے کا پروگرام لے کر چلیں گے آپ بھی ساتھ ہیں۔ دھیمی آواز اور جذبات کے ساتھ انگریزی زبان میں کہا۔ Don't Betray Your Chairman ہلکے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔



Evening Performance
Serial No. 143 Rs. 15
THE BRITISH COUNCIL
PRESENTS
THE NEW
SHAKESPEARE COMPANY
OF LONDON
IN
Richard II
14th October, 1964, at 6-30 p.m.
OPEN AIR THEATRE, BAGH-I-JINNAH
GARDENS, LAHORE
Seat No. F 24

مجھے وہ شام یاد آئی جب مورخہ 14 اکتوبر 1964ء کو New Shakespear Company of London نے باغ جناح کے Open air theater میں Richard II کی پرفارمنس دی تھی۔ میں نے یہ دیکھی تھی۔ King Richard II کے بول:

Feed not thy sovereign's foe, my gentle earth,

Nor with thy sweets comfort his ravenous sense; But let thy spiders,

انگریزی زبان میں ان کی delivery پرفیکٹ تھی۔ اب وہ کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ دوسرے لوگ ساتھ دینے اور وفاداری نبھانے کی یقین دھانی کروانے لگے۔ کچھ لوگ چھوٹی سی تقریر بھی کرتے۔ ماحول خاموش اور sober رہا۔ پھر جے اے رحیم کا نام سیکرٹری جنرل کے لیے propose کیا

گیا۔ Unanimously ٹھیک ہے۔ جے رحیم صاحب ڈائس پر بولنے کے لیے آئے تو بھٹو صاحب نے ان کا خود کھڑے ہوکر تعارف کروایا۔ ہماری اس پارٹی میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے ممبر ہیں۔ چار پانچ زبانیں جانتے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں کا لٹریچر پڑھا ہے۔ تاریخ ، ادب ، فلسفہ، معاشیات ، سیاسیات پڑھا ہے۔ پرانے ICS ہیں۔ چیف سیکرٹری رہے ہیں۔ امریکہ ، فرانس اور بہت سے ملکوں میں سفیر رہے ہیں۔ Sir Abdur Rahim (مصنف کے Muslim Juries prudence) کے صاجزادے ہیں۔ guide کریں گے۔ جھنڈا بھی انہوں نے ترتیب دیا ہے۔ Explain کریں گے۔ اب جے رحیم صاحب نے بولنا شروع کیا۔ پہلے تو دو چار فقروں سے ایسے لگا کہ دقیق فلسفے کی Terminology میں بات کریں گے اور Marxcism پر ایک Intellectual discourse ہونے جارہا ہے۔ مگر حاضرین محفل کی طرف دیکھنے کے بعد (جو بھی انہوں نے محسوس کیا ہوگا) بالکل brief ہوگئے۔

انگریزی زبان میں کہا، To Cut short, socialism is knowledge applied مجھے یہ تعریف پسند آئی۔ dogmatism کی مکمل نفی۔ Criticism کا جائز مقام۔ evolution of thought کو تسلیم کرنا۔ یہی Marxcism کی spirit ہے۔ (Progressively Continuously) Use of knowledge for the creation of a classless, e xploitation free society.

میں نے اسے اس sense میں لیا۔ یہ optimism تھا یا gullibility میں اس وقت نہیں سمجھ پایا۔ euphoria بہالے جانے میں مدد

دیتا ہے۔ شیخ محمد رشید ایڈووکیٹ (بعد میں بابائے سوشلزم) نے اپنی تقریر میں غریب کسانوں، مزارعین کے ساتھ ہونے والے ظلم کے ساتھ اپنے جذباتی لگاؤ کا اظہار کیا۔ رسول بخش تالپور سندھ کے aristocrat بھی تشریف لائے تھے۔ درمیانہ قد مضبوط جسم اور رویہ میں بہت اعتماد اور فخر۔ انہوں نے Surrealist Painter Dali[1] جیسی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ جوان کے رویے کو فخریہ انداز دیتی تھیں۔ انہوں نے تقریر میں فرمایا کہ آپ ایوب خاں کے خلاف بھٹو کے ساتھ کھڑے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک ڈھال ہیں۔ جیسے بزرگوں کا پیٹھ پر ہاتھ ہوتا ہے۔ مجھے میر صاحب کی زیادہ نہ بولنے والی شخصیت بہت بھائی۔ بس اٹل فیصلہ۔ مجھے Warmth محسوس ہوئی۔ ایک مضبوط دھڑا بننے جارہا ہے۔

اب ایک اہم مسئلہ پارٹی کا نام تھا۔ تین نام propose کیے گئے۔

۱۔ Socialist Party of Pakistan

۲۔ Pakistan Socialist Party

۳۔ Pakistan Peoples Party

سات، آٹھ منٹ کے وچار کے بعد سارے ہاؤس نے People Party کے نام پر اتفاق کیا۔ سب لوگ مطمئن نظر آتے تھے۔ منشور پر بھی ایک چھوٹا پمفلٹ تھا (اسلام جمہوریتِ سوشلزم) جناح اور اقبال کے اسلامی سوشلزم کے بینر بھی لگائے گئے تھے۔

اب دوپہر کی ایک بریک (Break) ہوئی تو میں کوٹھی سے باہر سامنے مارکیٹ میں چائے کی تلاش میں نکل گیا۔ کھانے کے بعد ایک اور session

۱۔ بیسویں صدی میں مصوری کی پُر احتجاج تحریک سلوا ڈور ڈالی اس تحریک کا سب سے قد آور مصور تھا۔ مصوروں کا یہ گروہ انسانی خوابوں کو مصور کرتا تھا۔ اور اس میں رمزیت اور ایمائیت تلاش کرتا تھا۔

ہونا تھا۔ دو دن کنونشن تھی مگر ایک دن کے انتظام سے آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ سب کچھ سمجھ آ گیا ہے۔ بھٹو صاحب بھی بڑے اچھے لگے۔ پارٹی کو دل نے مان لیا ہے اور زیادہ ٹھہرنے اور سننے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ واپس اوکاڑہ آ گیا۔

اب جب اوکاڑہ آیا تو آہستہ آہستہ دوستوں اور واقف کاروں کو پتہ چلا کہ اظہر بھی کنونشن سے ہوکر آیا ہے۔ تو مجھ سے مختلف سوالات پوچھنے لگے۔ تم کیوں اُس کی پارٹی میں شامل ہوگئے؟ وہ تو شرابی ہے۔ میں کہتا ''ہوگا''۔ وہ کہتے ڈکٹیٹرشپ کی بات کرو، جمہوریت کیسے آئے گی؟ میں کہتا بڑا مسئلہ ملک میں جمہوریت لانا ہے۔ زیادہ تر لوگ یہ Objection کرتے کہ وہ ایک بڑا جاگیردار ہے وہ کیسے Socialism کی باتیں کرتا ہے؟ ہاں ہے۔ دیکھیں گے۔ ابھی تو جاگیرداری کے خلاف بولتا ہے۔ دیکھیں گے کس رخ حالات جاتے ہیں۔ ہم تو بہتری کی اُمید لے کر چلے ہیں۔ شہر میں جہاں بھی گئے لوگوں نے دلچسپی ظاہر کی کچھ لوگ سخت مخالف اور دوسرے مین میخ (Inquisitive) نکالنے والے تھے۔

وکلاء کی تعداد تقریباً بیس تھی۔ ان سے بحث ہوتی مگر وکلاء کبھی بحث کو Conclusion تک نہیں لے جاتے۔ البتہ کالج کے پروفیسرز خوب بحث کرتے۔ مجھ سے ذاتی سوالات بھی پوچھتے کہ میں کیوں شامل ہوا؟ میرے گھر والوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے بڑے بھائی (چچا زاد) مجھے نااہل اور بیوقوف کہتے تھے۔ میں کچہری سے فارغ ہوکر ڈیسنٹ ہوٹل میں چائے پینے آتا تو بھی کسی نہ کسی سے بحث چل نکلتی۔

یہ باتیں 1968ء کی ہیں پیپلز پارٹی کو اوکاڑہ میں منظم کر رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے محلے کے دوستوں کو ترغیب دینی شروع کی۔ میرے

دوست ظہیر بابر صاحب سمجھدار اور مخلص انسان تھے۔ انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ وہ مجھے بتاتے رہتے کہ فلاں شخص سے رابطہ کرو۔ اُس کی سوچ صحیح ہے وہ شامل ہوسکتا ہے۔ ظہیر بابر کے مشورے سے ہی میں ایک چائے کے کھوکھے پر جانا شروع ہوا۔ جہاں ایک نوجوانوں کا گروپ بیٹھتا تھا۔ وہ سب لوگ ظہیر صاحب کے دوست تھے۔ اور میں بھی انہیں جانتا تھا۔ ان میں سے کچھ میرے گہرے دوست تھے۔ جلدی ہی ہم سب ایک سوچ والے بن چکے تھے۔ یہ دوستوں کا گروپ بے لالچ اور مخلص نوجوانوں کا گروپ تھا۔ جس چائے کے کھوکھے پر ہم بیٹھتے تھے اسے ایک دس ،بارہ سال کا لڑکا چلاتا تھا۔ دوکان کے مالک کو پتہ چلا کہ بھٹو پارٹی کے لوگ وہاں بیٹھتے ہیں۔ حکومت کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ تو اس نے دوکان خالی کروالی۔ اس غریب لڑکے کا جس کا نام محمد حنیف پاکستانی تھا بڑا نقصان ہوا۔ اس نے حق بازار کی گلی میں اپنی بیٹھک میں چائے کی دوکان کھول لی۔ سب لوگ وہاں جانے لگے۔ ساتھ ہی چوہدری عبدالرزاق اور مرزا اکرم کا گھر تھا۔ اب یہ حق بازار کی گلی بھٹو پارٹی کا ایک سنٹر بن گئی۔ راؤ خورشید علی خاں صاحب یا دوسرے لیڈران جب جلسہ کے لیے آتے تو یہیں کھانا کھاتے اور آرام کرتے۔ دوسرا سنٹر ڈیسنٹ ہوٹل بن گیا کیونکہ میں پروفیسر سلیم جاوید اور امین فاروقی ایڈووکیٹ وہاں بیٹھتے تھے۔ پیپلز پارٹی میں دلچسپی رکھنے والے ہمیں اس ہوٹل میں ڈھونڈ لیتے تھے۔ یہ ہوٹل بہت لمبے لمبے سیاسی مباحثوں کا مرکز بن گیا۔ یہ ہوٹل رات 12 بجے تک کھلا رہتا۔

پیپلز پارٹی میں پہلے لوگ جو شامل ہوئے ان میں قاضی نفیس، غالب ریاض، مرزا اکرم، چوہدری رزاق عرف دیپک ، امین بادشاہ ، رانا الطاف خاں، سائی (احسان الحق) ، سعید منٹو، کاکا شار، جُن ، ظفر مسعود، پرویز، پرویز بک ڈپو،

نسیم حیدر مقدر بک ڈپو، ظہیر بابر تھے۔ ستلج کاٹن ملز سے غنی لنگڑا، بابا شکور، راؤ حنیف، ظہور لودھی اور خادم حسین تھے، طالب علموں میں سیف الرحمٰن (آفس سیکرٹری)، نصیر احمد، خالد عزیز تھے۔

اب پارٹی ممبر شپ کی کاپیاں چھپ چکی تھیں اور راؤ عبدالستار ایڈووکیٹ نے لاہور سے وصول کر کے مجھے بھی پہنچا دیں۔ ساہیوال ان دنوں ضلع اور اوکاڑہ تحصیل تھی۔ ساہیوال سے کوئی کنونشن میں تو شامل نہ ہوا۔ مگر پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ جن میں راؤ خورشید علی خاں صاحب پاکستان سے پہلے بھی اسمبلی کے نمائندے رہے تھے۔ جماعت اسلامی سے پیپلز پارٹی میں آئے تھے۔ دیانتداری کے لیے مشہور تھے اور بہت جوشیلے مقرر تھے۔ میں نے ان سے زیادہ دیانت دار شخص اپنی پوری سیاسی زندگی میں نہیں دیکھا۔ راؤ عبدالستار ایڈووکیٹ، اکرم دیال ایڈووکیٹ، سردار علیم ایڈووکیٹ، نذر منصور ایڈووکیٹ، عسکری حسن ایڈووکیٹ اور کچھ نئے وکلاء۔ حکیم شاہنواز اور ممتاز حکیم شامل ہوگئے۔ راؤ خورشید صاحب کو ضلع ساہیوال کا صدر چن لیا گیا۔ بھٹو صاحب نے راؤ خورشید اور حکیم شاہنواز کو پنجاب کا دورہ کرنے کو کہا۔ انہوں نے مختلف اضلاع میں تقریریں کی۔ حکیم شاہنواز بہت پر اثر مقرر تھے۔ Reason سے argument کو آگے بڑھاتے اور موقع کی مناسبت سے شعر بھی quote کرتے۔ انہیں ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ پارٹی کے لیے بہت خدمات ہیں۔ برتن تک بیچ کھائے۔ بھٹو خوش قسمت تھا کہ شاہنواز جیسے committed کارکن ملے۔

اب اور لوگ جو پارٹی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ حق بازار یا ڈیسنٹ ہوٹل آنے لگے۔ اور ممبر بننے لگے۔ NAP سے سلیم باغی اور بھا رشید آگئے۔

عالم شیر لودھی، چوہدری بوٹا غلہ منڈی والے، مشتاق بھٹی پارٹی میں آ گئے۔ ستلج کاٹن ملز سے بہت مخلص دوستوں کا اضافہ ہوا۔ اُستاد رشید سندھی محلہ والے بھی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ استاد رشید ستلج ملز کی ٹریڈ یونین کے صدر بھی تھے۔ صوفی عنایت رنگوں والے پارٹی میں آ گئے تو بازار میں بھی ہمارا حصہ بن گیا۔ باٹا صاحب، کرنل جعفر، جیدی اور ان کے والد چوہدری داؤد صاحب پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ہم سب نوجوانوں کارکن تھے۔ لوگ ہمیں لڑکوں کی پارٹی کہتے اور مذاق اڑاتے۔ ہم چاہتے تھے کہ کوئی جانا پہچانا معزز آدمی ملے تو اسے صدر بنائیں۔ اس کے لیے ہم نے بہت سے شرفاء کو دعوت دی مگر ہچکچاہٹ میں جواب ملا۔ ایک دن میں اور نسیم مقدر بک ڈپو، شیخ ریاض کے پاس گئے اور انہیں پارٹی کا صدر بننے کو کہا۔ انہوں نے کہا کہ میں تو ایک بوڑھا آدمی ہوں کیا کر سکوں گا؟ ہم دونوں نے جواب دیا کہ شیخ صاحب آپ نے تو صدر ہی بننا ہے کام تو سارا ہم لوگوں نے کرنا ہے۔ جلسے میں ہم آپ کو لے جایا کریں گے آپ نے جا کر صرف کرسی پر بیٹھ جانا ہے۔ شیخ ریاض صاحب راضی ہو گئے ہمیں دفتر کھولنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ میں نے اپنی دکان واقع وینس چوک کے چوبارہ میں پارٹی کا دفتر بنالیا۔ نیچے میرے بڑے بھائی (چچا زاد) کی Diesal کی ایجنسی تھی۔ کئی جگہ اخبارات میں پارٹی کے دفتر پر حملوں کی خبریں بھی چھپی تھیں۔ میرے بھائی صاحب نے مجھے بہت جھڑکیاں دیں اور کہا یہ الو کا پٹھا بازار کو آگ لگوانا چاہتا ہے۔ میں ڈھیٹ بن کر خاموش رہا۔ دفتر میں راؤ خورشید صاحب اور راؤ عبدالستار آئے تو پارٹی عہدوں کے لیے باقاعدہ الیکشن بھی ہو گیا۔ شیخ ریاض صاحب شہر کے صدر اور میں تحصیل کا جنرل سیکرٹری، عالم شیر لودھی جوائنٹ سیکرٹری اور خزانچی چوہدری عبدالرزاق منتخب کر

لیے گئے۔ اب ہم تقریباً 50 کارکنوں کا گروپ بن چکا تھا۔

ہماری سرگرمیاں بڑھنا شروع ہوئیں۔ اب ہم نے جلسے کرنے کا پروگرام بنانا شروع کیا۔ ایک دن محمد حنیف پاکستانی کے چائے خانے میں بیٹھے تھے کہ اطلاع آئی کہ ستلج کاٹن ملز کی یونین نے ایوب حکومت کی مزدور دشمن پالیسی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالنے کا اعلان کیا ہے۔ مزدور مل کے سامنے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ہم سب اچانک خبر سے پریشان ہو گئے۔ ہماری کوئی تیاری نہیں تھی۔ پھر بھی ہم نے جلوس نکالنے اور مزدوروں کے جلوس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے پاس صرف تین بھٹو صاحب کی تصویر کے پوسٹر تھے۔ ان کو گتے پر چپکا کر اور نیچے لکڑیوں کے دستے لگا کر چل پڑے۔ اس جلوس میں میں ہی بڑا تھا۔ باقی سب پندرہ، سولہ سال کے نوجوان، صرف میں اور پرویز لمبے اور باقی سب چھوٹے قد کے تھے۔

ریلوے لائنوں کو کراس کر کے شیخ بستی کی تنگ گلیوں میں سے گزر کر جب ہم ستلج کاٹن ملز کے سامنے پہنچے تو یونین کے جلوس پر لاٹھی چارج ہو رہا تھا۔ میں اور پرویز کھڑے رہے۔ جو ہمارے جلوس میں چھوٹے بچے تھے انکو گلیوں میں بھیج دیا۔ اگر کسی کو چوٹ آجاتی تو ان کی مائیں ہمیں نہ چھوڑتیں۔ کامریڈ عبدالسلام اور عزیز عجمی جو جلوس کو لیڈ کر رہے تھے، انہیں گرفتار کر کے پولیس نے ویگن میں ڈال لیا۔ جلوس منتشر ہو گیا۔ زخمیوں کو پکڑ پکڑ کر لانے لگے۔ سب سے زیادہ چوٹیں ملاّ کامریڈ بجنوری کو آئیں۔ ملا کو مل کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ شیخ وحید صاحب اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر نے ملا کو دو بوری آٹے کی دے دیں کہ بیچ کر پیسے جمع کروا دینا۔ ملا مل کے دروازے کے سامنے مزدوروں کے ہاتھ آٹا بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے لگا۔

کیوں کہ لاٹھی چارج کے بعد اس کو اتنی چوٹیں آئی تھیں کہ کام کے قابل نہ رہا تھا۔ اب پارٹی میں چوہدری سعید احمد مجھیانہ ایڈووکیٹ کے شامل ہونے سے پارٹی کو بہت تقویت ملی۔ چوہدری صاحب سینئر وکیل تھے۔ ان کی راوی کے علاقے میں لمبی چوڑی برادری تھی۔ راوی کے کلچر، زبان اور سماجی تعلق کی بنا پر اس علاقہ میں پیپلز پارٹی مقبول ہونا شروع ہوگئی۔ میں نے اور عالم شیر خاں لودھی نے فیصلہ کیا کہ پارٹی پھیلنے لگ گئی ہے۔ ہمیں اب پارٹی کو شہری اور دیہاتی علاقوں میں تقسیم کرنا پڑے گا ورنہ control مشکل ہوجائے گا۔ شہر میں ستلج کاٹن مل اور 12 کے قریب Ginning فیکٹریاں اور ایک بڑی فلور مل تھی۔ اس کے علاوہ کچی بستیوں کی بڑی تعداد تھی۔ مشہور جگہیں غلہ منڈی، کالج اور کچہری تھیں۔ گویا پارٹی کی سرگرمیوں کا مرکز شہر ہی تھا۔

چاچا فضل، ارشد، ملک سرور، بابا لطیف، عزیز مجھیانہ، شریف حسین منشی، منشاء علی بھٹہ، تحصیل کے سرکردہ کارکن تھے۔ یہ سب جنونی کارکن تھے۔ شہر اور گاؤں دونوں جگہ کام کرتے۔ دیہاتوں میں غریب کسانوں میں کام کرتے۔ بابا لطیف بستی مصیبت پورہ کے کارکن تھے۔ بہت ہی مخلص اور دیانتدار انسان تھے۔ جو مصائب اس کارکن نے جھیلے انکو سوچ کر دل پھٹ جاتا ہے۔ تبدیلی کے لیے غریب کارکنوں نے دل دہلا دینے والی قربانیاں دیں۔ مگر اس ملک کے حالات نہ سدھر سکے۔

پہلا جلسہ ستلج کاٹن ملز کے سامنے کیا۔ مل کے مزدوروں اور شیخ بستی کے کارکنوں نے انتظام کیا۔ اس جلسے سے راؤ خورشید علی خاں اور حکیم شاہنواز انجم نے address کیا۔ گو دونوں مقرر بہت اچھے تھے۔ لیکن لوگوں کی حاضری کمزور رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پارٹی متعارف ہورہی تھی۔ اسلامی سوشلزم کو

explain کرنے کی ضرورت تھی۔ جماعت اسلامی مخالفت میں تھی۔ پارٹی کے منشور کو غیر اسلامی کہتے تھے۔ راؤ خورشید علی کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ پہلے جماعت اسلامی میں رہے تھے۔ جماعت اسلامی کی منافقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ اس لیے جماعت ں فتوا بازی کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ شہر کے فوارہ چوک میں مسلم لیگ نے جلسہ رکھا۔ حکومت کی کارکردگی کی تعریفیں اور بھٹو پارٹی کی کامیابی کو ناممکن کہا۔ جماعت اسلامی بھی حکومتی پارٹی کی عملاً ساتھی تھی۔ اس کے جواب میں اگلے ہفتے ہم نے فوارا چوک میں جلسہ رکھا۔ ہمارے پاس اکیلے راؤ خورشید علی خاں مقرر تھے۔ دوسرے عالم شیر خاں لودھی تقریر کر لیتے تھے۔ کالج میں وہ ایک اچھے Debater تھے۔ مگر آنکھوں کی بینائی ختم ہوگئی۔ ایک کارکن تھا جو سریلی آواز میں نعت پڑھتا تھا۔ جلسہ کی سٹیج پر شیخ ریاض کو بٹھاتے۔ ایک دو نعتوں کے بعد عالم شیر تقریر کرتے اتنے میں ساہیوال سے راؤ خورشید صاحب اور حکیم شاہنواز بھی پہنچ جاتے۔ تب جلسے میں گرمی پیدا ہوجاتی تھی۔

اگلے ہفتے مسلم لیگی اور جماعتیے جلسہ کی ڈیٹ دیتے۔ باہر سے کسی مقرر کو بلاتے ۔نواب زادہ نصر اللہ بھی آگئے۔ مولانا نورانی کو بھی بلایا گیا۔ جسٹس مرشد مشرقی پاکستان والے بھی آئے۔ ایک جلسہ وہ کرتے اگلے پندرہ دن کے اندر ہم ایک جلسہ کرتے۔ پھر اُن کی طرف سے جلسہ اکھاڑنے کی ترکیب نکالی گئی۔

عوام کے درمیان ایک آدمی بیٹھ جاتا۔ جب تقریر پورے جوبن پر ہوتی تو وہ ان کے درمیان سے اٹھ کر ایک سوال کر دیتا۔ جواب کے دوران ایک اور سوال کر دیتا تو بحث چھڑ جاتی جو" تو تو"، "میں میں" میں بدل جاتی۔

اس طرح جلسہ ناکام ہو جاتا۔

جماعت کا ہمدرد شوکت نائی سائیکل کرائے پر دینے کا کام کرتا تھا۔ باڈی بلڈر قسم کا جوان تھا۔ وہ اس ٹیکنیک میں ماہر تھا۔

شیخ ریاض ، راؤ خورشید علی صاحب، عالم شیر یا اور کوئی مقرر سٹیج پر ہوتا۔ ہم کارکن سٹیج کے آگے اور پیچھے شرارت کو روکنے کے لیے ہوتے تھے۔ اس دن جب شوکت سٹیج کے سامنے بیٹھا تو میں نے اپنی گھڑی اور کوٹ اُتار کر خالد عزیز عرف جگو کو پکڑا دیئے۔ راؤ یاسین نے کہا کہ وہ پستول لے آتے ہیں اور ساتھ رہیں گے۔ بائی عاشق علی میرے گاؤں کا کارکن تھا اُسے میں نے سمجھایا کہ میرے پیچھے رہے تاکہ کوئی پیچھے سے حملہ نہ کرے۔ ہم تیار کھڑے تھے۔ شوکت نے راؤ خورشید صاحب کی تقریر کے دوران اُٹھ کر بازو کھڑا کر کے اور انگلی نکال کر سوال کرنا شروع کیا تو میں نے فوراً جا کر اسے گردن سے پکڑتے ہوئے سٹیج کے سامنے سے دور لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اب اس کو کہا کہ جناب یہاں سے سوال کریں۔ جلسہ نہ اکھاڑیں۔ وہ چپ ہو گیا اور کہا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ ہمارا جلسہ امن و امان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جلسوں کے اختتام پر جب لوگ جا رہے ہوتے تھے تو امین بادشاہ مختلف لوگوں سے کہتا کہ راؤ خورشید صاحب نے ٹھیک باتیں کی ہیں۔ یہ کام امین بادشاہ ہر جلسہ کے اختتام پر کرتا رہتا۔ اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

شوکت کی ترکیب تو کامیاب نہ ہوئی۔ مگر جسٹس مرشد کے جلسے میں ہماری ترکیب کامیاب رہی۔ ہم پیپلز پارٹی کے کافی کارکن جلسے میں شامل ہوئے۔ اور علیحدہ علیحدہ کھڑے ہو گئے۔ جسٹس کی تقریر کے دوران میں نے کارکنوں کو اشارہ کیا کہ آؤ چلیں اور میں چل پڑا۔ کارکن بھی چل پڑے۔ جلسہ ناکام ہو گیا۔

اب جلسوں کو اکھاڑنے کی کوششوں کے بعد ایک Unwritten truce قائم ہوگیا کہ ایک دوسرے کے جلسے نہ اکھاڑے جائیں۔ اپنے اپنے جلسے میں سوالوں کے جواب دیئے جائیں۔ اب باری باری دس، پندرہ دن بعد فوارہ چوک میں جلسے ہوتے۔ ہم نے کوثر نیازی کو بلوایا۔ رات کو جلسہ میں کوثر نیازی نے قرآن و حدیث کے حوالہ جات کی مدد سے تقریر کی۔ اس تقریر کا اثر ہوا۔ لوگ پارٹی کے موقف کو اسلام کے منافی نہ ہونے کو تسلیم کرنے لگے۔ اب ہمیں یہ محسوس ہونے لگا کہ پیپلز پارٹی کے خلاف مزاحمت کم ہونی شروع ہوگئی ہے۔ اب ہمیں اپنا پلہ بھاری محسوس ہونے لگا۔

اوکاڑہ کالج کے طالب علموں اور محلوں کے لڑکوں نے مل کر جلوس نکالا جس میں نعرہ لگایا ''ایوب کتا ہائے ہائے'' اس جلوس میں لڑکے ایک کتا بھی پکڑے ہوئے تھے۔ لوگ ہنسنے لگے مگر اس سے یہ تو ظاہر ہوتا تھا کہ لوگوں میں صدر ایوب خان کے خلاف کتنی نفرت پائی جاتی ہے۔

رانا غلام صابر سابقہ MLA اور ممبر کنونشن مسلم لیگ بھی PPP میں شامل ہوگئے۔ ظہیر بابر اور امین بادشاہ کے ساتھ مرزا اکرم کی بیٹھک میں آئے اور ممبر شپ کی پرچی بھری۔ رانا صاحب بہت منجھے ہوئے سیاستدان تھے اور ہر الیکشن میں کامیاب ہوتے رہے تھے۔ ان کے پارٹی میں آنے سے لوگ کہنے لگے کہ یہ پارٹی جیتنے والی ہے۔ اسی لیے رانا غلام صابر اس میں شامل ہوئے ہیں۔ مگر رانا صاحب نے کہا کہ وہ الیکشن میں کھڑے نہیں ہوں گے۔ ان کی صحت خراب ہوچکی تھی۔ ڈاکٹرز نے آرام تجویز کیا تھا۔ انہوں نے دیہاتوں میں پارٹی کے لیے Campaign کی کیونکہ ان کا ایک مضبوط دھڑا تھا۔

1968-69ء میں پیپلز پارٹی کا ممبر بننے کے لیے چار آنے چندہ تھا۔

مل ایریا، کچی بستیاں، تانگے والے، ڈرائیورز کلنڈر، ریڑھی والے، خواجہ سرا، اُس بازار والے پارٹی ممبر بن گئے۔ ہمارے دوست سرفراز خاں منا کی بدولت یہ ہمارا سب سے مضبوط یونٹ تھا۔ اُس یونٹ کا صدر بھی منے خاں کو بنایا گیا۔دیہات میں غریب لوگ اور مزارعین، چھوٹے زمیندار، چھوٹے دوکاندار،غریب طالب علم سب پیپلز پارٹی میں شامل ہونے لگے۔

اب دور شروع ہوا محلوں میں Corner meetings کا۔ میرے خیال میں یہ دور سب سے اہم ہے۔ ایک محلے سے کوئی آدمی آتا اور کہتا کہ ہمارے محلے میں آؤ۔ لوگ سننا چاہتے ہیں۔ میں اور نصیر سائیکل پر بروقت پہنچ جاتے۔ دعوت دینے والے کی بیٹھک میں لوگ جمع ہوتے۔ اور میں پارٹی کا منشور بیان کرنے کے بعد کہتا کہ کسی بھائی کو کوئی سوال کرنا ہو تو کرے اور بحث شروع ہوجاتی۔ 20-25 لوگوں کے مجمع کے اندر بیٹھ کر سمجھانا اور اُن کے شک دور کرکے ان کو مطمئن کرکے اٹھنا ایک ایسا tool ہے جو آپ کے لیے بہترین اور بااعتماد کارکن بناتا ہے۔ ایسے کارکن آپ سے ایک سیاسی سے زیادہ ذاتی رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ آپ کو اور اُنکو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہوتا ہے۔ ایسے کارکنوں کو کامریڈ کہنا چاہیے۔ ان کامریڈز کا پیار کا رشتہ اور منزل ایک ہوتی ہے۔ اس کے بعد Study circles شروع کرنے چاہیں۔ مگر پیپلز پارٹی کی سیاست کا tempo اتنا تیز تھا کہ سوچنے اور کچھ کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔ یہ کمی محسوس ہوتی رہی کہ پختہ شعور اور علم والے کارکن نہ بن پائے جو مشکل حالات میں خود ایک دیا بن جائیں۔ بہرحال Corner meetings نے رنگ دکھایا۔ اوکاڑہ میں اتنے کارکن بنے کہ لائیلپور کے علاوہ (جس کا مقابلہ نہیں ہوسکتا کیونکہ بڑا انڈسٹریل اور کاروباری شہر ہے) سب شہروں سے زیادہ تھے۔

اب ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس کی تاریخ نزدیک آرہی تھی۔ میں نے کہا جن کارکنوں نے کانفرنس میں شرکت کے لیے جانا ہے وہ تیاری کرلیں۔ ایک لاری کرایہ پر لی۔ اس میں 65 کارکن جن مین زیادہ تر کا تعلق مل ایریا سے تھا۔ شہر سے میں نصیر، سیف، منیر تھے روانہ ہوئے لاری کے اوپر پارٹی کا ترنگہ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جو سڑک کے کنارے جھکی ہوئی کیکر میں الجھ گیا۔ لاری روکی گئی۔ کیکر کانٹوں سے بھری تھی مگر راؤ حنیف جو مل مزدور تھے نے کہا یہ ہمارا جھنڈا ہے۔ ہمارا نشان ہے۔ اسکو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ کیکر پر چڑھ گیا۔ پھٹا ہوا جھنڈا اُتار لایا۔ دوبارہ لاری پر نصب کردیا۔ راؤ حنیف کے سارے جسم بازوؤں اور ٹانگوں پر سینکڑوں کانٹے چبھ گئے اور خون رسنے لگا۔ وہ بانہوں کو ملتے ہوئے کہتا رہا کہ کوئی بات نہیں۔ معمولی بات ہے۔ مجھے جھنڈے کی اہمیت راؤ حنیف نے سمجھائی۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ سٹیشن پر پہنچ گئے اور گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر گھومنے لگے راؤ خورشید علی خاں صاحب اور حبیب اللہ خاں سعدی صاحب کمالیہ والے سابقہ خاکسار دونوں کی ایک استقبالیہ کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اوکاڑہ سے کامریڈ عبدالسلام اور ان کی بیگم صاحبہ اور دو چھوٹی بچیاں بھی سٹیشن میں پلیٹ فارم پر موجود تھیں۔ سب نے لال ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ ہم نے بھی لال ٹوپیاں لے کر پہن لیں۔

تھوڑی دیر کے بعد Train کے آنے کی گھنٹی بجی اور گاڑی کی آمد محسوس ہوئی۔ گاڑی سٹیشن میں داخل ہونے کا عجیب منظر تھا۔ پوری گاڑی کارکنوں سے بھری ہوئی تھی اور وہ کھڑیوں سے باہر سرخ جھنڈے نکالے ہوئے تھے۔ ڈبوں کی چھتوں پر بھی سرخ جھنڈے لیے کارکن کھڑے نعرے لگا

رہے تھے۔ روسی اور چینی رسالوں میں سرخ جھنڈوں والی تصویریں دیکھی تھیں۔ مگر یہ تو زندہ تجربہ تھا۔ بہت جذباتی ماحول بن گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ولولہ محسوس ہونے لگا۔ مولانا بھاشانی صاحب کو ٹرین سے اتارا۔ پیچھے سینکڑوں کارکن بھی نعرے مارتے ہوئے اترے۔ استقبالیہ کمیٹی مولانا صاحب کو سٹیشن سے باہر لائی باہر ایک بیلوں والا گڈا جس پر ایک چارپائی بچھی تھی اور اس چارپائی پر مجنوں کھیس بچھایا گیا تھا اور ایک تکیہ، مولانا چارپائی پر نیم دراز ہوگئے۔ پراندی پر کراچی کی ٹریڈ یونین لیڈر کنیز فاطمہ اور دوسرے لیڈر بیٹھ گئے اور گڈا چل پڑا۔

اب اس سے بھی زیادہ دل بھرآنے والا منظر آیا۔ تحصیل ٹوبہ کے ہر گاؤں سے کسان کمیٹی اپنا بینر (کسان کمیٹی چک نمبر 35 گ ب) دو آدمی آگے کھولے ہوتے۔ اور آگے ڈھول بجاتے ہوئے پیچھے کسی میں25-30-50 ممبر بھاگتے ہوئے مٹی اڑاتے ہوئے۔ سٹیشن پر مولانا صاحب کی Reception کے لیے آرہے ہیں۔ایک گاؤں کی کمیٹی ختم ہوتی تو تھوڑے عرصے بعد دوسرے گاؤں کا ڈھول اور بینر آرہا ہوتا۔ پوری تحصیلوں کی کمیٹیاں پہنچ رہی تھیں۔ میرے آنسو نکل آئے اور دل ولولے سے بھر گیا۔ کچھ کرگزرنے کو دل کرتا تھا۔

مولانا بھاشانی صاحب کا گڈا چل رہا تھا۔ ایک گاؤں کی کمیٹی نے گڈے کو روک کر بیلوں کے آگے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا ڈالنا شروع کردیا۔ جب تھک کر رک گئے تو گڈا چل پڑا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد دوسرے گاؤں کی کمیٹی نے روک کر بھنگڑا شروع کردیا۔ ہم بھی گڈے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ تیسرے گاؤں کی کمیٹی نے گڈا روک کر بھنگڑا شروع کیا تو سیف

بھی بھنگڑے والوں میں شامل ہوگیا۔ پھر منیر شامل ہوگیا۔ ان کے بعد میں اور نصیر بھی شامل ہوگئے۔ اگلے گاؤں والوں کے ساتھ ہم پھر شامل ہوئے اب ہم ہر گاؤں کے ساتھ بھنگڑا ڈالتے رہے۔ پورے تین میل تک جہاں خیمہ گاؤں بنایا گیا تھا۔ ہم اپنے Stamina پر حیران تھے۔ ابھی ہم تھکے نہیں تھے۔ منزل پر پہنچ کر وہاں کچھ لوگ بھنگڑا ڈال رہے تھے ہم ان میں بھی شامل ہوگئے۔ خوشی اور ولولہ ایسا تھا کہ ہر فکر بھول گیا تھا۔ شاید A State of Bless اسی کو کہتے ہیں اب مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ انقلاب ضرور آئے گا۔ ہم اپنی زندگی میں انقلاب دیکھیں گے۔

خیمہ گاؤں میں تندور لگے ہوئے تھے۔ جہاں روٹی اور چنے یا ماش کی دال ملتی تھی۔دال سے روٹی کھا کر زمین پر بغیر بستر کے سوگئے۔ نہ تھکاوٹ نہ کوئی سوچ نہ کوئی فکر رہی۔ صبح اٹھے ہاتھ منہ دھوکر چنے روٹی چائے سے ناشتہ کر لیا۔ اور گھومنے لگے۔ لائلپور سے سب دوست آئے ہوئے تھے۔ رانا سخاوت نے کہا کہ یہاں CID بہت ہے کسی کو نام پتہ نہ بتانا۔ فیض صاحب بھی تھے۔ میجر اسحاق ، چوہدری فتح محمد صاحب تو خیر میزبان تھے۔ England سے نسیم باجوہ بھی آیا ہوا تھا۔ پیپلز پارٹی سے پہلے 1959ء لاہور میں نسیم باجوہ ان کی بیگم اور ہم لوگوں نے مل کر ایک گروپ بنایا تھا۔ میں اس کا سیکرٹری تھا۔ شاہدرہ ٹاؤن لاہور میں meeting ہوتی تھی۔ ایک میٹنگ کے Chief Guest احمد ندیم قاسمی تھے۔ جس میں انہوں نے اپنا افسانہ سنایا ایک حسین کشمیری لڑکی جو ان کے دفتر میں مانگنے آئی تھی کے بارے میں تھا۔ دری پر بیٹھے لوگوں سے کمرا بھرا پڑا تھا۔ان میں فلم ایکٹر علاؤ الدین بھی شامل تھا۔ جو کہتا تھا کہ ہم لوگ وقت نہیں نکال سکتے۔ ہم سے پیسے لے لیا کرو۔ Printing وغیرہ کے لیے نسیم

باجوہ پیسے لے لیتا۔ پہلی دفعہ محترم استاد دامن کو دیکھا۔ دروازے میں کھڑے قمیض اتاری ہوئی لطیفہ سنایا کہ جدھر جاؤ آگے ایوب خان۔ کسی محکمے سے واسطہ پڑے گا آگے ایوب خان جیسے لائلپور کا گھنٹہ گھر۔ یہ ایوب بھی پاکستان کا گھنٹہ گھر ہے۔ لوگ ہنسنے لگے۔ باجوہ نے لاہور سے انگلینڈ جا کر رسالا نکالا۔ کچھ شمارے ملے۔ پھر رابطہ ختم ہوگیا۔ بعد میں ٹوبہ کسان کانفرنس میں ملے۔ ہم دونوں بڑی پنڈال میں جلسہ سننے چلے گئے۔ مولانا بھاشانی صاحب نے تقریر شروع کی۔ یہ سرخ جھنڈا امام حسین کا جھنڈا ہے۔ انقلاب کا جھنڈا ہے۔ ایوب حکومت کی غلط پالیسیوں نے عوام کو مایوس اور بددل کردیا ہے۔ اور اعلان کیا کہ ہم مشرقی پاکستان والوں نے اپنی NAP علیحدہ بنالی ہے۔ آپ مغربی حصے والے اپنا علیحدہ صدر چن لو۔ (مغربی حصہ میں ولی خان کو چنا گیا) اس کے بعد مسیح الرحمٰن جن کا تعلق مشرقی پاکستان کی NAP سے تھا، نے تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کی زیادتیوں نے انہیں سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ ایوب خان ملک کا غدار ہے۔ ایوب خان ملک کا غدار ہے۔ ایوب خان ملک کا غدار ہے۔ تین دفعہ بلند آواز میں کہا۔ سٹیج پر سے انہیں ہتھ کڑی لگا کر لے جایا گیا۔ جلسہ منتشر ہوگیا۔ کامریڈ عبدالسلام نے کہا بس مشرقی پاکستان علیحدہ ہوگیا سمجھو۔ مولانا صاحب نے یہ کانفرنس یہ کہنے کے لیے بلائی ہے کہ انہیں علیحدگی کے لیے مجبور کیا گیا ہے اور ایوب خان ملک کو توڑ رہا ہے۔ ایوب ملک کا غدار ہے۔

Conference ختم ہوگئی اور ہم بسوں میں بیٹھ کر اوکاڑہ واپس آگئے۔ دانشوروں میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کا ذکر شروع ہوگیا۔ پھر مولانا صاحب کبھی مغربی پاکستان نہیں آئے۔ اپنی جھونپڑی میں رہتے رہے جس میں ایک کرسی اور چند چارپائیاں تھیں۔ نواب کالا باغ گورنر مغربی

پاکستان (ملک امیر محمد خاں) مشرقی پاکستان گئے مولانا کو ملنے بھی گئے۔ مولانا صاحب نے کہا سنا ہے تم بہت قتل کراتے ہو۔" یہ بات ایک بنگالی کامریڈ نے ملک افضل وٹو کو بتائی۔ ملک افضل کو جنرل اعظم خان نے اوکاڑہ میں ایک سوال پوچھنے پر جو کہ فوج کی طرف سے لاہور میں نافذ کیے گئے جزوی مارشل لاء کے متعلق تھا، چار سال کی قید سنائی تھی یہ واقعہ 1953ء کا ہے۔ایوب خان اور کالا باغ دور میں جسٹس کیانی نے بھرپور طنز (satire) کیے۔ انہوں نے کہا کہ اکثر حکمران عوام کو سبز باغ دکھاتے ہیں مگر اس حکومت نے عوام کو کالا باغ دکھایا ہے۔ جبر کے دنوں میں لطیفوں کی زبان میں بات کرنا مقبول ہوجاتا ہے۔ شادیوں پر بھانڈ بھی سیاسی لطیفے سناتے ہیں۔

صرف اوکاڑہ سے 65 پی پی کے کارکن ٹوبہ کانفرنس میں شامل ہوئے۔ قصور سے صرف احمد رضا قصوری، لائلپور سے اکیلا سخاوت رانا اس کے علاوہ کسی جگہ سے کوئی پیپلزپارٹی کا کارکن شامل نہیں ہوا۔ احمد رضا ہم سے مل کر بھنگڑا ڈالتا رہا۔

ٹوبہ کسان کانفرنس سے آنے کے بعد نشہ سا رہنے لگا۔ یہ کیفیت ایک مہینہ کے لگ بھگ رہی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس میں جن لوگوں نے شرکت کی انہوں نے حکمران طبقے کے پاؤں تلے زمیں کو ہلتے ہوئے محسوس کیا ہوگا۔ میں نے پورے پاکستان کو ہلتے ہوئے محسوس کیا۔ میں دوستوں سے کہتا کہ پاکستان rapids میں داخل ہوچکا ہے۔ آگے جھال آنے والی ہے۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے انقلاب دیکھیں گے۔ انقلاب کی آمد کا ایمان لیے قبر میں نہیں جائیں گے جیسے ہم سے پہلی نسل کے ورکر رخصت ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگ رہنما کامریڈ عبدالسلام جو بستر مرگ پر سرطان (Cancer) کے باعث بہت نحیف

ہو چکے تھے۔ان کی خیریت دریافت کرنے (میں اور بھا حمید) گئے۔ تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا ''اور آئیں گے عشاق کے قافلے''۔ کہنے لگے ''اگلے موڑ پر پھر ملیں گے'' دو دن بعد ہم سے جدا ہو گئے۔

ٹوبہ کانفرنس کے بعد آنے والے یوم مئی کو خوب تیاری کی۔ پہلے صرف ستلج کاٹن ملز والی یونین کے ورکرز ہی یوم مئی کا جلوس نکالتے تھے۔ اس دفعہ کلیانہ فامرز کے مزارعین شریف حسین منشی، امین فاروقی ایڈووکیٹ کی قیادت میں گڈوں کا جلوس لے کر شامل ہوئے اور ان کے ساتھ پیپلز پارٹی اوکاڑہ شہر کے کارکن بھی جوش و جذبہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ اوکاڑہ میں یوم مئی کا سب سے بڑا جلوس تھا۔ اس سے مزدوروں اور کسانوں کے درمیان آپس میں بھائی ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ دونوں اگر مل کر نہیں چلیں گے تو انصاف کیسے جیت سکیں گے؟

اس کے بعد عید میلادالنبیؐ نزدیک آرہا تھا۔ ہم لوگوں نے جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔مگر دوستوں نے محسوس کیا کہ مولویوں کے دوسرے جلوسوں میں ایک ہمارا جلوس اپنی علیحدہ شناخت نہ بنا پائے گا۔کچھ دوستوں نے مشعل بردار جلوس کی تجویز رکھی۔ ایک مل ایریا کے کارکن نے کہا کہ حقے کی چلم میں لکڑی لگا کر چلم میں مل سے Discerded کی ہوئی روئی جو صفائی کے لیے استعمال کی جاتی ہے diesal سے بھگو کر جلائی جائے تو بہت اچھی مشعل بن جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا بڑا تجربہ ہے۔ لہذا مشعل بردار جلوس کا فیصلہ ہو گیا۔چلمیں اکٹھی کی گئیں۔ ضائع شدہ روئی، ڈیزل اور ایک مٹی کا تیل بیچنے والی ریڑھی میں ڈیزل بھر کر ساتھ کر لی۔ جس کی مشعل ذرا dim ہو ساتھ ساتھ diesal ڈالتے جائیں تو بجھتی نہیں۔ شام کے وقت مل گیٹ کے سامنے مشعلیں

اٹھائے تمام مزدور اور شہر سے کارکن لائنوں میں کھڑے ہوگئے۔ چلموں میں diesal ڈال دیا گیا۔ سورج غروب ہونے لگا تو single file جلوس مشعلیں لیے روانہ ہو پڑا۔ جوں توں اندھیرا بڑھا۔ مشعلوں کا روپ نکھر گیا۔ شہر میں جلوس داخل ہوا تو لوگ حیران ہوکر جلوس دیکھنے آنے لگے۔ انوکھا ہونے کی وجہ سے داد ملنے لگی۔ شہر میں پورے بازاروں میں قناتیں اور بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ مشعل لے کر قناتوں کے نیچے سے گزرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کسی بھی کارکن کی ذرا سی لغزش سے آگ لگ سکتی تھی اور ہم پر یہ الزام کہ انہوں نے جان بوجھ کر یہ شرارت plan کی ہے۔ پولیس والے بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ اور روایتی طریقے سے اپنی چھڑی سے روکتے بھاگتے۔ تھانیدار کو سانس چڑھی ہوئی تھی۔ جلوس کے ساتھ ساتھ ہم چل رہے تھے۔ جب قناتوں کے نیچے سے گزرنے لگتے تو ہم بھاگ کر مشعلوں کو نیچے کرواتے۔ میرے پاؤں میں ہوائی چپل تھی وہ ٹوٹ گئی تو میں ننگے پاؤں بھاگنے لگا۔ تھانیدار صاحب آپ ہٹ جائیں۔ ہم خود ہی control کریں گے۔ ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔ تھانیدار مطمئن ہوکر کھڑے رہے۔ ہم نے بہت محنت اور بھاگ دوڑ سے جلوس کو قناتوں کے نیچے سے کامیابی کے ساتھ گزار لیا۔ خدا کا شکر کیا۔ آگے چل کر حبیب بنک کے سامنے بجلی کا transformer تھا۔ کاکا نثار ایک بانس کے دونوں کناروں پر جلتی ہوئی آگ کو گتکے کی طرز پر چلا رہا تھا کہ آگ کا ایک بڑا شعلہ ٹوٹ کر transformer میں جا اٹکا۔ بس! میں نے سوچا ایک بڑا دھماکا ہوگا اور پورے شہر کی بجلی اڑ جائے گی۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور آنکھیں بند کرلیں خدا کا شکر ہے وہ شعلہ خود ہی بجھ گیا۔ ہارنیاں والے چوک میں جلوس کو ختم کردیا (آگے آبادی کم تھی)۔ پارٹی پر لادینت کا لیبل

مڑھنے کا حربہ کمزور پڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ محنت کی جائے تو administration کرنا بھی مشکل کام نہیں ہے۔ 1969ء میں بھٹو صاحب کا جب اوکاڑہ شہر میں پہلا جلسہ تھا۔ اس جلسے کے لیے ہم نے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ پہلے کارکنوں نے اپنا اپنا حصہ ڈالا اس کے بعد ہم بازار میں عام چندے کے لیے نکلے۔ مرزا اکرم رزاق، سائی احسان الحق، نصیر، میں (اظہر)، بائی بشیر، ظفر مسعود، وغیرہ ہمیں مختلف بازاروں میں دوسرے کارکن بھی ملتے رہے۔ پھر چیدہ چیدہ شہریوں سے جو پارٹی کے ہمدرد تھے چندہ لیا۔ روپیہ، دو روپے، ریڑھی والوں سے ، ہمدرد دکانداروں نے پانچ دیے۔ بشیر صاحب (ریلوے سٹیشن کو آنے والی سڑک پر بس سٹاپ کے نزدیک رہائش) نے ہمیں شام کو اپنے گھر آنے کو کہا۔ میں اور نصیر سائیکل پر شام کو ان کے گھر پہنچے تو بھائی صاحب ہمارے انتظار میں گھر کے باہر کھڑے تھے۔ پہلے چائے پلائی۔ چائے تو گھر آنے والے کو سبھی پلاتے ہیں۔ انہوں نے جس پیار سے چائے پلائی مجھے وہ چائے اب تک نہیں بھولی۔ پھر 35 روپے چندہ دیا۔ ایک غریب آدمی نے اتنا چندہ میرا دل بھر آیا۔ اب تک کا یہ سب سے زیادہ چندہ تھا۔ ایک ریڑھی والے نے 20 روپے دیئے تو میں نے کہا کہ ریڑھی والے سے اتنے نہیں لے سکتے۔ یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ اُس نے کہا ”لے لو کوئی بات نہیں۔“

کل چندہ-/3000 (تین ہزار) روپے جمع ہوا۔ اسی میں ہمارے جلسے کا خرچہ پورا ہوا۔ بڑے سائز کے اشتہار، بھٹو کی بڑی تصویر کیساتھ، ”سرمایہ داروں کی مٹھی کھول دیں گے۔“ موٹے حرفوں میں چھپوائے گئے۔ ایک کمرے سے اونچا اور بڑا پختہ اینٹوں کا سٹیج۔ چھت کے لیے 50 شہتیر لکڑ منڈی والوں نے مفت دیئے۔ شہتیر جوڑ کر مضبوط چھت بنائی اور دری بچھائی گئی۔ اوپر قنات،

سب کچھ اسی رقم میں پورا ہوا۔ رزاق جی ہمارے خزانچی تھے۔ انہوں نے بہت سلیقے سے اخراجات کو چلایا۔ لاؤڈ سپیکر کا انتظام شیخ صاحب (محبوب ٹورنگ سینما والے) نے ایسا اچھا کیا کہ پورے شہر میں ایک جیسی آواز پہنچی۔

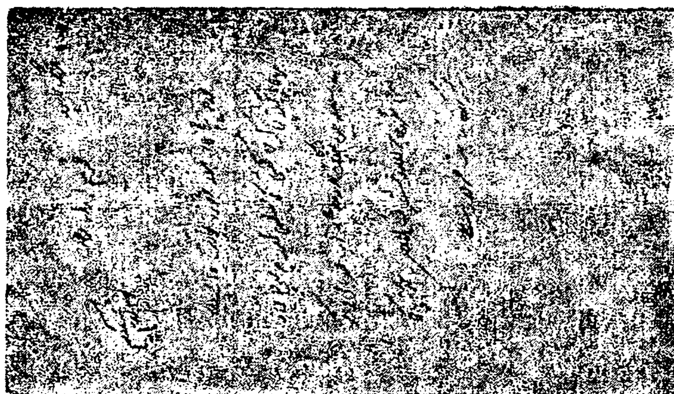
انتظامات، چندہ، اشتہار لگانے، لاؤڈ سپیکر کو تانگے میں نصب کر کے ملک قدیر کا محلوں، سڑکوں پر اعلان کرتے رہنا۔ تو روزانہ کی روٹین بن چکی تھی۔ جلسہ میں اصل مشکل جو بنی وہ اوکاڑہ کی انتظامیہ سے جھگڑا تھا جو جلسہ کے مقام کے بارے میں ہوا اور serious شکل اختیار کر گیا۔ جلسوں کے بارے میں حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جلسہ کرنے سے پہلے ہر پارٹی کو جگہ، وقت، تاریخ کے بارے میں پندرہ دن پیشگی اطلاع دینی لازمی ہوگی۔ جو کہ ہم نے رولز کے مطابق اطلاع دے دی۔ جگہ جو چنی گئی وہ اوکاڑہ کا کمیٹی پارک تھا۔ یہاں ایک سٹیج بھی بنا ہوا تھا اور یہاں پہلے بھی جلسے ہوتے رہے تھے۔ ہم پارٹی والوں نے اشتہار چھپوا کر جگہ وقت تاریخ کے ساتھ سارے شہر اور پوری تحصیل کے دیہاتوں میں لگوا دیے۔ لاؤڈ سپیکر والے تانگے سے شہر اور نزدیک والے گاؤں میں اعلان شروع کر دیتے۔ دس دن گزر گئے اشتہار وغیرہ لگ چکے اور جلسہ میں صرف پانچ دن رہ گئے۔ تو انتظامیہ کی طرف سے کہا گیا کہ کمیٹی پارک میں جلسہ نہیں ہوسکتا۔ پودے اور پھول خراب ہوں گے۔ شہر کے صدر کو بلاوا آیا کہ AC صاحب کے دفتر میں ان سے ملو۔۔۔ میں اور سلیم باغی AC صاحب کے دفتر پہنچے۔ فرمایا کہ وہاں جلسہ نہیں ہوسکتا۔ پھول خراب ہوں گے۔ یہ National Property ہے آپ کو احساس ہونا چاہیے۔

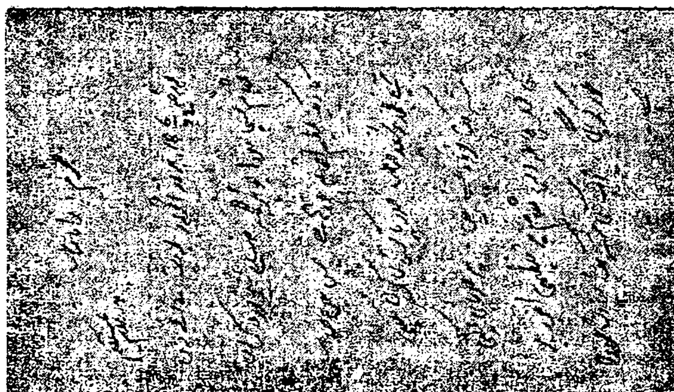
ہم دونوں نے بہت Serious چہروں کے ساتھ کہا جمہوری حقوق بہت اہم ہوتے ہیں۔ پھول اگر خراب بھی ہو جائیں تو دوبارہ اگا لیے جاتے

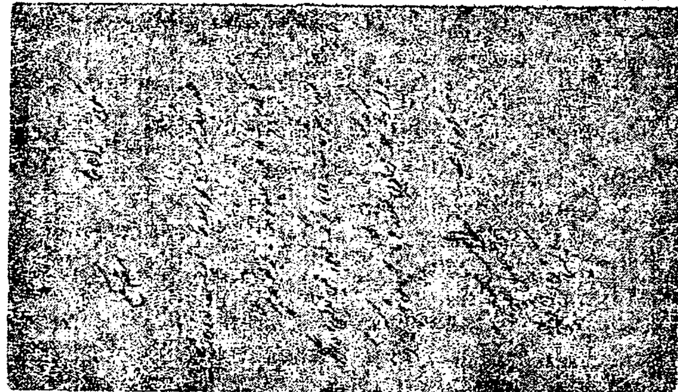
ہیں۔ ہم نے ان کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔ چند منٹ تک دونوں اطراف خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر ہم اٹھ کر آ گئے۔ آ کر سب دوستوں کو تفصیل سے آگاہ کردیا۔ شام کو شیخ ریاض، راؤ خورشید، عالم شیر میں اور سلیم باغی AC صاحب کی کوٹھی گئے۔ AC صاحب کوٹھی کے لان میں تشریف لائے اور کہا کہ وہاں جلسہ نہیں ہوسکتا۔ کسی اور جگہ کریں۔ راؤ خورشید صاحب نے کہا ہم اشتہار پوری تحصیل کے دیہات اور شہر میں لگوا چکے ہیں اور چار دن میں اب اشتہار بھی دوبارہ نہیں چھپ سکتے اور جو rules ہیں ہم نے 15 دن سے زیادہ عرصہ پہلے باقاعدہ Written اور proper طریقے سے جلسہ کی اطلاع دے رکھی ہے۔ دس دن گزر چکے ہیں۔ مگر AC صاحب نہ مانے۔ ہم پانچوں اٹھ کر آ گئے۔ راستے میں ہمیں رانا غلام صابر خاں ملے۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا فیصلہ ہوا ؟ ہم نے بتایا کہ انکار ہوگیا۔ رانا صاحب نے کہا ! منڈیو آؤ ایک دفعہ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ راؤ خورشید صاحب اور شیخ ریاض گھروں کو چلے گئے میں عالم شیر اور سلیم باغی دوبارہ رانا غلام صابر خاں صاحب کیساتھ AC صاحب کے لان میں جا بیٹھے۔ چپڑاسی نے اطلاع دی تو صاحب لان میں آئے۔ رانا غلام صابر نے کہا۔ کہ ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ یہ انکار کیوں ہوا ہے۔ تمام procedure پورا کیا گیا ہے۔ اب کوئی نئی جگہ بھی تلاش کرنی ممکن نہیں اتنے تھوڑے عرصے میں۔ تمام دیہاتوں میں ہم اطلاع بھی نہیں پہنچا سکتے۔ صرف پانچ دن تو بچے ہیں۔ AC صاحب کی وہی acting رہی۔ رانا غلام صابر کو غصہ چڑھنا شروع ہوگیا۔ انہوں نے اپنی کھدر کی چادر اٹھا کر کندھے پر رکھتے ہوئے کہا کہ اے اسی صاحب ’’جلسہ اتھے ای ہوئے گا۔ اٹھو منڈیو چلیئے۔‘‘ ہم کوٹھی سے باہر آ گئے۔ پھر ہمیں ساہیوال DC صاحب کے حضور پیش

بند کرنے لگا تھا۔ میں نے اسے روکا۔ کہ بھٹو صاحب کی کار آنے لگی ہے کھول دو اس نے پھاٹک کھول دیا۔ اتنے میں کار پہنچ گئی۔ اور پھاٹک کو کراس کیا۔ ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ کار لاہور کی طرف مڑ گئی۔ مصطفیٰ کھر drive کر رہے تھے پچھلی seat پر بھٹو صاحب کو درمیان میں بٹھایا ایک آدمی ان کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف بیٹھ گیا۔ پھاٹک کراس کرانے کے بعد آرام کا سانس لیا۔ انتظامیہ سے جھگڑا اور جلسے کا انتظام بخوبی اختتام کو پہنچا۔ پھر ہفتہ بھر کارکنوں کی گپیں کہ میں نے ایسے کیا، فلاں نے ویسے کیا۔ سب کارکنوں نے محنت سے کام کیا۔ بھٹو صاحب میں ایک طرح کی اپیل تھی۔ ملنے سے آدمی اپنا گلا شکوہ بھول جاتا تھا۔ جلسہ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد سٹیج پر پیپلز پارٹی ساہیوال کے لیڈر بھی آ گئے۔ رانا غلام صابر بھی بھٹو صاحب سے بغل گیر ہوئے اور بھٹو کا نعرہ لگایا۔ اوکاڑہ کی سیاسی فضا بدل گئی۔ اب پیپلز پارٹی یہاں کی مقبول ترین پارٹی بن گئی تھی اور پیپلز پارٹی ہی اوکاڑہ کی مضبوط ترین جماعت بھی بن چکی تھی۔

ایک دن مرزا اکرم اور رزاق جی دیوا کی بیٹھک میں چائے پی رہے تھے۔ دوستوں نے پرانے وقتوں والی کرکٹ کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جس وقت جناب حفیظ کاردار صاحب پاکستان کرکٹ ٹیم کے Captain ہوتے تھے۔ حقیقت میں وہی پاکستان میں کرکٹ کو International سطح پر لے جانے والے ہیں۔ ہم ان کے بڑے Fan تھے۔ ہر کرکٹ میچ گراؤنڈ میں جا کر دیکھتے تھے۔ کاردار صاحب کو گراؤنڈ میں ہی دیکھا تھا۔ بہت دبدبہ تھا۔ Player ان سے ڈرتے تھے۔ کاردار صاحب بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔







পোষ্ট কার্ড

POST CARD

পোষ্ট কার্ড

POST CARD

পোষ্ট কার্ড

POST CARD

اب لاہور میں بھی تیزی سے کام ہو رہا تھا۔ A-4 مزنگ روڈ پر وکلاء کے دفاتر میں شیخ محمد رشید کا بھی دفتر تھا۔ وہ پنجاب پیپلز پارٹی کے صدر تھے۔ ہر اتوار دفاتر کے نزدیک ایک خالی پلاٹ کو صاف کر کے اور قنات لگا کر کرسیاں رکھی جاتیں اور میٹنگ کی جاتی۔ مختلف اضلاع سے کارکن آتے ۔ میں اور چند دوست اتوار کو ضرور اس صوبائی میٹنگ کو attend کرتے تھے۔ شروع میں مصطفےٰ کھر، حنیف رامے اور ڈاکٹر مبشر بھی meetings میں آتے رہے۔ ان میٹنگز کی حاضری 35-30 سے نہ بڑھی۔ ان میٹنگز کے روح رواں تاج محمد لنگاہ بار ایٹ لاء تھے۔ بہت سوالات کرتے نقطے اٹھاتے تو گرما گرم بحث ہوتی۔ انکی حاضری بھی باقاعدہ تھی۔ امان اللہ آفس سیکرٹری بھی بہت سرگرم کارکن تھا۔ کھدر کے خاکی کپڑے اور بڑی مونچھیں۔ ایسی ایکٹنگ کرتے جیسے کوئی بڑی انقلابی تحریک چلا رہے ہوں۔ پارٹی برسرِ اقتدار آئی اور کھر گورنر بنا تو امان اللہ کھر صاحب کا پریس سیکرٹری بن گیا۔ کوئی کارکن ملنے گیا تو آنکھ ملانے سے کتراتا۔ کام نکل گیا تھا۔ اب وہ منظر ہی سے غائب ہوگیا۔ شیخ محمد رشید صاحب نے ایک کسان کمیٹی بھی بنائی۔ اس کی بھی meetings ہوتی تھیں۔ کسان کمیٹی کے ایک سرگرم کارکن جو اپنے آپ کو کمیونسٹ pose کرتے تھے ان کا نام امین تھا وہ بھی امریکہ چلے گئے۔

ہم دوستوں نے فیصلہ کیا۔ کہ حفیظ کاردار صاحب کا اوکاڑہ میں جلسہ کروائیں۔ کپتان صاحب کو نزدیک سے دیکھیں گے۔ رزاق لاہور جا کر ان سے جلسے کی تاریخ لے کر آیا ۔ گڈے خانے میں جلسہ ہوا۔ کاردار صاحب کو نزدیک سے ملنے اور دیکھنے کی پرانی آرزو پوری ہوگئی۔ اب وہ کرکٹ گراؤنڈ والی grace نہ رہی تھی۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ بھٹو صاحب کا میدان سیاست

تھا اور کپتان صاحب کا میدان کرکٹ۔ ہمارے دونوں ہیرو اکٹھے ہوگئے تھے اور grace میں برابر تھے۔ پیپلز پارٹی کی تحریک یا سیاست (جو بھی کہیے) میں مشکل مرحلے بھی آئے۔ مگر مجموعی طور پر بہت خوشگوار تجربہ رہا۔ کیونکہ جو کارکن تھے وہی گہرے دوست تھے۔ ہر وقت دوستوں کی محفل کا سماں رہتا۔ دوسرے لوگوں کے لیے سیاست Jalousies competition اور hatred کا پھل لاتی ہے۔ ہمارے لیے خوشگوار ماحول اور قلبی سکون لائی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہماری منزل نہ power نا fame تھی۔ بلکہ ایک نظریہ تھی۔ ملک میں جمہوری اور معاشی حقوق کے لیے جدوجہد۔

ایوب خان نے retirement کا اعلان کردیا اور ملک کی باگ ڈور جنرل یحییٰ خان کے سپرد کردی۔ انہوں نے الیکشن کی لمبی ڈیٹ دے دی۔ خود یحییٰ خان عیش وعشرت کی محفلوں میں مصروف رہے۔

جناب محمود علی قصوری ایڈووکیٹ پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ انہیں vice chairman کا عہدہ دیا گیا۔ شیخ رفیق، خالد محمود بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ کامریڈ عبدالسلام اور ملک افضل وٹو (سرگودھا والے) NAP میں ہی رہے۔ جناب حبیب جالب صاحب بھی NAP میں رہے۔

اب اوکاڑہ میں ایک سازش ہوئی۔ چوہدری عبدالرزاق متعدد بار میونسپل کمیٹی اوکاڑہ کے چیئرمین رہے تھے۔ انکا راجپوت برادری میں اثر و رسوخ تھا۔ شہر میں بھی شرفاء اور کاروباری حلقوں میں اہمیت تھی۔ خالد محمود (ایڈووکیٹ بعد میں ہائی کورٹ جج) کے رشتے دار تھے۔ محمود علی قصوری صاحب کی سیاسی طاقت بڑھانے کے لیے اوکاڑہ کی Peoples Party پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ NAP والے دوست بھی ان کے ساتھ تھے۔ پارٹی پر قبضے

کے بعد عہدوں اور ٹکٹوں پر اجارہ داری قائم کرنا چاہتے تھے۔ لہذا بھٹو صاحب کو چوہدری عبدالرزق کے سینما سے ملحقہ کوٹھی میں بلایا گیا کہ اوکاڑہ میں ایک اہم شخصیت پارٹی میں شامل ہوگی اور پارٹی کی بنیاد رکھی جائے گی۔ اُنکو یہ تاثر دیا گیا کہ اوکاڑہ میں پیپلز پارٹی نہیں ہے۔

اوکاڑہ میں گول چوک مسجد کے چوبارہ میں پارٹی کا دفتر تھا۔ وہاں ہم چار کارکن بیٹھے تھے۔ راؤ خورشید علی صاحب، سلیم باغی، سیف اور میں ہم کو اطلاع ملی کہ بھٹو صاحب چوہدری عبدالرزاق کے سینما آئے ہوئے ہیں۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ پہلے تو یقین نہ آیا۔ پھر indignant ہوگئے۔ کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ چاروں اٹھے فوراً لاری اڈہ کے سامنے سینما پہنچے۔ تو بھٹو صاحب کو کھڑے دیکھ کر یقین آ گیا۔ علاقے کے چیدہ چیدہ معتبرین کو مدعو کیا گیا تھا۔

ہم چاروں احتجاج کے لیے سامنے کھڑے ہوگئے۔ بھٹو صاحب نے ہمیں دیکھا تو function رک گیا۔ ہمیں کہنے لگے کہ آگے آجاؤ۔ لیکن ہم تو احتجاج میں ڈٹے کھڑے تھے۔ راؤ عبدالستار بہت منت سماجت کے ساتھ کہنے لگے کہ راؤ خورشید صاحب آگے تو آجائیں۔ ہم چپ ڈٹے رہے۔ پھر بھٹو صاحب خود اسرار کرنے لگے کہ ایک دفعہ میرے پاس تو آؤ۔ ہم چاروں وہیں کھڑے رہے۔ راؤ خورشید صاحب آگے گئے اور کہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ضلع کا صدر اور شہر کا صدر باہر کھڑے ہیں ان کو آنے کا علم ہی نہیں ہے اور یہاں بھٹو صاحب شرفا کو address کررہے ہیں۔ بھٹو awkward صورت حال کو face کررہے تھے۔ انہوں نے راؤ صاحب کو سٹیج پر آنے کے لیے کہا۔ میں نے ان کا بازو پکڑ کر سٹیج پر چڑھنے میں مدد کی۔ تو بھٹو صاحب نے فوراً ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا کہ یہ ہیں 1970ء کے ہونے والے الیکشن

میں اوکاڑہ کی قومی اسمبلی کی سیٹ سے ہمارے نمائندے۔ پھر کہا کہ جنرل امراؤ خان کو ہرائیں گے؟ ہم نے کہا ہاں ہرا دیں گے۔اس طرح اوکاڑہ کی قومی اسمبلی کی ٹکٹ کا بہت پہلے ہی اعلان ہوگیا۔ساری سازش فلاپ ہوگئی۔ وہ شرمندہ ہوگئے۔ اب چوہدری رزاق صاحب کی ناظر صوبائی ٹکٹ کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔

جنرل ریٹائرڈ راؤ امراؤ خاں کنونشن مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے مشترکہ امیدوار تھے۔ انہیں راؤ برادری کے ووٹ دلوانے کے لیے راؤ افضل اور برادری کے دوسرے زعما نے سی ایم آر ہائی سکول میں راؤ برادری کی میٹنگ بلائی۔ دیہاتوں سے غریب راجپوت اس اکٹھ میں شامل ہوئے۔ ڈاکٹر راؤ علی بہادر کا بیٹا ہمارا ہمدرد تھا۔ اس نے سیف کو بتایا کہ سکول میں برادری کا اکٹھ ہورہا ہے۔ تاکہ جنرل امراؤ خاں کو راجپوت برادری کا سربراہ بنوا کر ووٹ لیے جائیں۔ میں نے سیف کو جلدی ساہیوال پہنچنے کے لیے کہا تاکہ راؤ خورشید علی کو اوکاڑہ کی اس میٹنگ میں شامل کیا جائے۔ راؤ صاحب پہنچ گئے۔ تو راؤ صاحب، سیف، صوفی عنائت کا بھتیجا (نام بھول گیا) نصیر اور میں پانچوں سکول پہنچ گئے۔ ہم چاروں گیلری میں کھڑے رہے مگر راؤ صاحب کو اکٹھ میں بھیج دیا جہاں لوگ جمع تھے۔ ہمارا موقف تھا کہ راؤ برادری راؤ خورشید صاحب کو اپنا سربراہ بنائے۔ کنور سعید ایڈووکیٹ بھی موجود تھے۔ ہم نے ان سے کہا راؤ خورشید کا زیادہ حق بنتا ہے۔ انہیں سیاست کا زیادہ تجربہ ہے۔ اچھے مقرر ہیں اور immage بھی دیانتداری کا ہے۔ راؤ صاحب نے dias سے اعلان کیا کہ وہ بھی برادری کے نمائندہ کے لئے امیدوار ہیں۔ دیہاتی برادری راؤ خورشید صاحب کے حق میں تھی۔ اس طرح راؤ افضل کی سکیم فیل ہوگئی۔ جب

راؤ افضل نے dias سے جنرل (ر) امراؤ خاں کے حق میں تقریر کرنے کی کوشش کی تو وہاں بیٹھے لوگوں نے شور کرنا شروع کردیا کہ ''ہم تو خورشید کے ساتھ ہیں۔'' ''ہم تو خورشید کے ساتھ ہیں'''' تو ہمیں بے وقوف سمجھتا ہے۔'' آخر تو تو میں میں اتنی بڑھی اور اتنا شور ہوا کہ کسی کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ راؤ افضل میز بجا کر خاموش ہونے کو کہتا رہا۔ meeting برخاست ہوگئی۔ حقیقت میں تو ہم اُسی وقت جیت چکے تھے۔

اب محلوں میں سرگرم ہوگئے۔ کارکنوں کے گھروں پر جھنڈے لگنے شروع ہوگئے۔ جو ہمیں جھنڈا نصیب کرنے کی دعوت دیتا ہم 80-70 کارکن اکٹھے اس کے گھر جھنڈا نصب کرنے جاتے۔

ایک چھوٹا سا فنکشن جس میں سلیم باغی تقریر کرتا۔ جھنڈا نصب کرکے تالیاں بجاتے اور چائے چلتی۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ چائے بند کی جائے۔ کیونکہ غریب آدمی تو پھر جھنڈا نہیں لگوائے گا۔ شربت سستا پڑتا تھا۔ ایک بڑی بالٹی میں سے ایک بوتل، ایک یا آدھا گلاس ہر کسی کو مل جاتا۔ جھنڈا کا symbolism جو بھی ہو سو ہو۔ باغی صاحب اپنی خوبصورت آواز میں موقع کی مناسبت سے صورت حال بیان کردیتے۔ سرخ رنگ امام حسینؑ کی یاد ہے۔ وغیرہ۔

جھنڈے لگانے سے پارٹی پھیلنی شروع ہوگئی۔ ہر محلے میں لوگ خود بھی لگانے لگے۔ بچوں میں جھنڈے خاص طور پر مقبول ہوگئے۔ اس عمل سے show down ہوا۔ جیتنے والی پارٹی سمجھ کر ہر کوئی اس میں شامل ہونے لگا۔ یہ ہمارے لوگوں کی psychology ہے کہ بھارے دھڑے میں جاتے ہیں۔ احمدی دوست اشتہار بازی میں مدد کرنے لگے۔ وہ اشتہار چھپوا کر ہمیں دے دیتے کارکن دیواروں پر لگا دیتے۔ احمدی بھٹو کے بہت supporter تھے۔

اسی طرح christian بھی۔

اب 1970ء کے الیکشن کے لیے ٹکٹوں کی تقسیم کا عمل شروع ہوا۔ اوکاڑہ کی قومی اسمبلی کی ٹکٹ کا فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ جسے کارکن support کریں گے اسے ٹکٹ دیا جائے گا۔ ملک افضل وٹو (سرگودھا والے) نے مجھے کہا۔ کہ سب ٹکٹیں تم خود ہی لے لوگے۔ Son of soil (مراد لوکل لوگ) کو بھی تو دو۔ میں اور مشتاق بھٹی رائے میاں خاں ایڈووکیٹ کو منانے گئے کہ الیکشن میں کھڑا ہو۔ اسے قائل کرلیا۔ میاں خاں غریب وکیل تھا۔ ڈرتا تھا۔ کہ مقابلے میں میاں نذیر ہے جو پرانا وڈیرا سیاستدان تھا۔ عالم شیر لودھی نے مجھ سے کہا کہ وہ محمد یار لاشاری کی صوبائی اسمبلی کی ٹکٹ کے لیے ضلعی صدر راؤ خورشید علی صاحب کو نہیں کہہ سکتے۔ میں نے راؤ صاحب ضلعی صدر پاکستان پیپلز پارٹی سے argue کیا۔ کہ لوکل لوگوں کا حق پہلے ہونا چاہیے۔ کارکن محمد یار اور شیخ ریاض کو support کرتے ہیں۔ صوبائی ٹکٹ شیخ ریاض کی بجائے چوہدری رزاق (میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ لاہور کی support سے) کو ملتی دکھائی دے رہی تھی۔ ان دنوں مرزا صاحب ۔ ربوہ کی مدد بہت اہم خیال کی جاتی تھی۔ میں اور سعید منٹو نے شیخ ریاض صاحب کو رات 12 بجے اٹھایا۔ ''کیا بات ہے اس وقت؟'' ہم نے کہا کہ ''ہماری ٹکٹ بڑی خطرے میں ہے۔'' مرزا صاحب بھی چوہدری رزاق کے supporter ہیں۔ ہم تینوں ڈاکٹر احمد مصطفٰے کی کوٹھی پہنچے۔ صبح ربوہ مرزا صاحب کے پاس شیخ صاحب اور ڈاکٹر احمد مصطفٰے کو روانہ ہونے کا فیصلہ کر کے واپس آئے۔ دونوں حضرات کے ربوہ جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ مرزا صاحب اس سیٹ پر neutral ہو گئے پہلے چوہدری رزاق کے حمایتی تھے۔ لیکن پھر بھی ٹکٹ

چوہدری رزاق صاحب کو مل گئی۔ اوکاڑہ کی NAP بھی ان کی سپورٹ میں تھی۔ منڈی اور بازار بھی ان کی سپورٹ میں تھا۔ صرف ہم کارکن لوگ شیخ ریاض کے supporter تھے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ اوکاڑہ میں آرائیں اور راجپوت کی دھڑے بندی کی سیاست کو توڑا جائے۔ ہم نے شیخ ریاض کو اسی لیے پیپلز پارٹی اوکاڑہ سٹی کا صدر اور آنے والے الیکشن 1970ء کے لیے اپنا امیدوار بنایا تھا۔ اوکاڑہ میں پیپلز پارٹی راجپوت اور ارائیں نوجوانوں نے مل کر بنائی تھی۔ ہم لوگ برادری ازم کے تعصب کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اور ہم نے الیکشن 1970ء میں اس تعصب کو ختم کر دیا تھا۔ مگر بعد کے دنوں میں پارٹی کی سیاست آگے جانے کی بجائے retrogression کا شکار ہوگئی۔ اب 1970ء کے الیکشن کے لیے ٹکٹوں کی اپیلیں شروع ہونے لگیں بھٹو صاحب کراچی میں تھے۔ نذر منصور نے ہم سے کہا کہ اگر ہم لوگ راؤ صاحب کو convince کرلیں کہ وہ اس کی اور شیخ ریاض کی اپیل کے لیے کراچی جائیں گے تو وہ (نذر منصور ایڈووکیٹ) ہوائی جہاز کی return ticket اور دوسرا سارا خرچہ برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ ہم لوگوں نے راؤ خورشید صاحب سے request کی کہ وہ اپیل کے لیے نذر منصور کے ساتھ جائیں۔ راؤ صاحب کراچی گئے۔ اور appeal میں پیش ہوئے کہا۔ کہ یہ لوگ کارکنوں کے متفقہ candidate ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے بھیجا ہے۔ ورنہ میں اور ''ہوائی جہاز'' کے اخراجات۔ اس طرح شیخ ریاض اور نذر منصور کو appeal میں ٹکٹ مل گیا۔

کارکنوں نے تانگے پر لاؤڈ سپیکر اور جھنڈے لگا کر مسعود رانا کا گایا ہوا گانا ''جاگ اٹھا ہے سارا وطن ساتھیو مجاہدو'' بجاتے ہوئے شہر اور بستیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ یہ گانا جذباتیت کو بہت فروغ دیتا ہے۔ اور ہیجانی کیفیت

پیدا کر دیتا ہے۔ یہ گانا کسی فلم کا ہے تاہم یہ پیپلز پارٹی کا ترانہ بن گیا۔ دور سے ہی گاؤں یا بستی والے جان جاتے تھے کہ پیپلز پارٹی والے آئے ہیں۔ جھنڈا بھی اپنے رنگوں کی وجہ سے بہت eye catching تھا۔ دونوں مل کر خوب جذبات کو ابھارتے تھے۔ اسی طرح سادہ منشور (روٹی، کپڑا اور مکان) عام آدمی کو بہت جلد سمجھ آیا۔ الیکشن campaign شروع ہوگئی۔ شیخ ریاض نے ایک پرانی jeep خرید لی جو کبھی چلتی تھی اور کبھی جواب دے دیتی تھی۔ کارکنوں نے کہا کہ روٹی اپنے اپنے گھر سے کھائیں۔ یہاں کوئی انتظام نہیں۔ جیپ میں تھوڑے بھنے ہوتے چنے رکھ لیے گئے۔

ایک دن پارٹی کے صوبائی دفتر 4-A مزنگ روڈ لاہور کی میٹنگ سے فارغ ہوکر ہم ڈاکٹر مبشر سے temple road ملنے چلے گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ پارٹی نے راؤ خورشید کے الیکشن اخراجات کے لیے 10 ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ تم لے جاؤ۔ ہم نے عرض کی Post سے بھجوا دیں تاکہ حساب ٹھیک رہے۔ جیپ میں راؤ صاحب شیخ صاحب کے علاوہ رانا الطاف خاں، منا، نصیر اور میں ہوتے تھے۔ شروع میں گاؤں کے درمیان جیپ کھڑی کر کے اتر آتے اور گھر گھر لوگوں سے ووٹ مانگتے تھے۔ ایک گاؤں میں ایک غریب آدمی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ سارے غریبوں نے بھٹو کو ہی ووٹ دینی ہے۔ آپ لوگ ہمارے پاس نہ آیا کرو۔ اس طرح چوہدری ہم سے ناراض ہوتے ہیں۔ لہذا ہم اس شخص کی ہدایت کے مطابق اب "جاگ اٹھا ہے سارا وطن مجاہدو" بجاتے ہوئے گاؤں کے چوک میں کھڑے ہوجاتے۔ کچھ لوگ اور بچے اکٹھے ہوجاتے۔ ووٹ مانگنے کے ساتھ چھوٹی موٹی تقریر کرتے۔ اور اگلے گاؤں کی طرف روانہ ہوجاتے۔ یہ طریقہ کار بہت کامیاب ہوا۔ ایک دن میں ساتھ

آٹھ گاؤں گھوم لیتے۔ کام بالکل آسان ہو گیا۔

رانا الطاف خاں دیہات میں ووٹ مانگنے کے بہت ماہر تھے۔ ایک گاؤں کے راستے میں چھوٹی نہر 2 فٹ گہری پڑتی تھی پل ٹوٹا ہوا تھا۔ الطاف خاں اس نہر میں سے گزر کر گاؤں میں گئے اور وہاں تقریر کی۔ گاؤں مسلم شیخ برادری کا تھا۔ پورا گاؤں بوڑھے، بچے اٹھائے ہوئے عورتیں سب پانی میں سے گزر کر جیپ کے پاس پہنچ گئے۔ راؤ خورشید صاحب اور شیخ صاحب کو ایسے تکنے لگے جیسے وہ فرشتے ہوں۔ ایک انتہائی غریب بوڑھی عورت شیخ صاحب کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر ایسے محسوس کرنے لگی جیسے اسے بہت زیادہ حوصلہ مل گیا ہو ناقابل بیان حد تک۔ نصیر نے پوچھا کہ رانا صاحب آپ نے ان لوگوں کو کیا کہا تھا۔ الطاف خاں سادے الفاظ میں بات سمجھانے کی زبردست خوبی رکھتے تھے۔ الیکشن campaign میں ان کا ساتھ ہونا ایک نعمت تھی۔ منے اور نصیر کی شخصیت ایسی تھی کہ campaign کے باوجود تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کسی کسی گاؤں میں چائے بھی پلائی جاتی تھی۔

گاؤں اور بستیوں میں سرکردہ کارکن سامنے آنے لگے۔ جن پر اعتماد کیا جاسکے اور voters list کی ذمہ داری ڈالی جاسکے۔ ایسے لوگ بڑے ایکٹیو active اور ذہین ہوتے ہیں۔

الیکشن والے دن پیپلز پارٹی کے پاس گاؤں میں اکثر لیڈیز پولنگ بوتھ پر پولنگ ایجنٹ بننے کے لیے کوئی تعلیم یافتہ خواتین نہیں تھیں کیوں کہ ہمارے ووٹر غریب اور غیر تعلیم یافتہ تھے۔ چوہدری خواتین انہیں دبکاتی تھیں اور ووٹ خراب کرتی تھیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے احمدی کارکن دوستوں نے بڑی قربانی دی۔ انہوں نے ڈیڑھ سو تعلیم یافتہ لڑکیاں ایک چوبارہ میں بٹھا

دیں۔ (گول مسجد والے چوک کے جنوب مغرب کونے میں ایک چوبارہ جہاں کسی زمانے میں افیون کا ٹھیکہ ہوتا تھا) جہاں بھی تعلیم یافتہ پولنگ ایجنٹ دستیاب نہیں تھی وہاں ایک لڑکی کو بھیجا جاتا اور پھر واپس بھی لے کر آتے۔ اس بات کو انہوں نے عام نہیں ہونے دیا۔ صرف مجھے Confidence میں لیا۔ اور کہا کہ اگر کوئی مسئلہ بنا تو تم ذمہ دار ہوگے۔

الیکشن والے دن خدا کا شکر ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقع نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غریب لوگوں نے چالاکی سے پرچی ادھر سے کٹوائی مگر ووٹ تکوار (پیپلز پارٹی کا نشان) کو ڈالا۔

اب ووٹوں کی گنتی شروع ہوچکی تھی۔ ہم سب حق بازار میں مرزا اکرم کے گھر جمع تھے۔ ظفر مسعود آیا تو اس نے بتایا کہ تین چار بوتھ پر گنتی مکمل ہوچکی ہے۔ ہمارے ووٹ بڑھے ہیں۔ جنرل امراؤ خاں ان بوتھ پر گئے تھے مگر مایوس ہوکر گھر چلے گئے اور لیٹ گئے۔ ہم نے خوشی سے چھلانگیں لگائیں۔ میں نے مولوی حنیف سے کس کے جھپی ڈال لی اور کہا کہ "جے مولوی اسی جت گئے تے کیہ ہوئے گا؟ ہم خوشی سے پھٹ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں اور خبریں آنے لگیں سب میں جیت ہورہی تھی۔ Tension ریلیز ہونے لگی۔ میں نے کہا مرزا اب تو چائے پلادے۔ رزاق نے کہا جاتا ہوں۔ بنوا کے لاتا ہوں۔ کارکن آتے رہے اور خوشی کی خبریں رات بھر سناتے رہے۔ بس ہم جیت گئے۔

صبح شیخ ریاض کی رہائش گاہ چکی سیٹھ گھاسی رام میں جمع تھے اور راؤ خورشید صاحب کے گلے میں گیندے کے ہار ڈالے ہوئے تھے۔ لوگ باری باری ان کے ساتھ کھڑے ہوکر فوٹو کھنچوا رہے تھے۔ مجھے بھی کہا کہ تم نہیں آتے۔ میں بھی گروپ فوٹو کے لیے گیا اور راؤ صاحب کے گلے سے سارے

ہار اتار کر نصیر کے گلے میں ڈال دیئے۔ ''اچھا یہ بات تھی'' راؤ صاحب نے پوچھا۔ واقعی deserve تو نصیر صاحب ہی کرتے ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ نصیر اس وقت سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اور کالج کے ڈرامے میں لڑکی کا رول ادا کیا کرتا تھا۔ میں Make Up کرتا تھا۔ میرا دوست پروفیسر سلیم جاوید کالج ڈرامے کا انچارج بھی تھا اور اداکار بھی۔ خالد عزیز عرف جگو (ڈرامے کا کردار) نصیر اور سیف تینوں طالب علم ورکر تھے اور ہر وقت میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ سیف آفس سیکرٹری کا کام بھی کرتا تھا۔

1970ء کے الیکشن قومی اسمبلی کی سیٹوں پر اوکاڑہ سے راؤ خورشید، حاجی صادق ربیرہ، صوبائی اسمبلی کی سٹیوں پر شیخ ریاض، محمد یار لاشاری، رائے میاں خاں کھرل جیت گئے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ جس کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن تھے پاکستان کی majority پارٹی بن گئی۔ انہیں کسی دوسری پارٹی کی سپورٹ درکار نہ تھی۔ لہذا Prime Minister بننا عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن کا حق تھا۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں بھٹو کے پاس majority تھی۔ وہ Leader of Opposition بنتے۔ یہ صورت نہ جنرل یحیٰی خاں کو نہ بھٹو کو قبول تھی۔ بھٹو بھی اپنا chance گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ کل آئے کہ نہ آئے کس کو پتا ہے۔ یحیٰی خان بنگالیوں کو Transfer of power کرنے سے ہچکچانے لگا۔ اس نے یہ نہ سوچا تھا کہ ایسی صورت بھی ممکن ہے۔ اس کا خیال تھا کہ Coalition بنے گی۔ مشرقی پاکستان میں شبہات پیدا ہونے شروع ہوگئے اور protest شروع ہوگئی۔ پرامن ریلیز پر لاٹھی چارج اور گولی چلی تو صورت حال بہت serious ہوگئی۔ اعتماد کی صورت نہ رہی تو riots شروع ہوگئے۔ مغربی پاکستان کے باشندہ افسران اور کاروباری لوگوں جو مشرقی

پاکستان میں تھے کی security کا مسئلہ بن گیا۔ وہ مغربی پاکستان کی فوج کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگے۔ مولانا مودودی نے کہا کہ پاکستان کا خدا ہی محافظ ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے لیے کہا تو بھٹو صاحب نے مینار پاکستان پر ایک بڑا جلسہ کیا۔ جس میں انہوں نے فرمایا کہ جو قومی اسمبلی کا ممبر ڈھاکہ جائے گا۔ پیپلز پارٹی کے کارکن اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ سٹیج کے آگے کارکنوں نے روائتی تالیاں تو بجائیں مگر ششدر سے ہو گئے۔ سمجھ نہ سکے کہ اس تقریر کا مقصد اور غرض کیا ہے۔جلسہ سننے کے بعد میں سوچنے لگا کہ اس تقریر کا مقصد Confederationبنانا ہے۔ یا مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنا ہے؟ اس کے بعد بھٹو صاحب ڈھاکہ گئے اور شاید شیخ مجیب سے ملاقات بھی کی یا صرف ہوٹل میں ٹھہرے اور حالات کا جائزہ لیا۔ اخبارات چپ تھے۔BBC کی اردو سروس سننے کی کوشش کرتے مگر وہ بھیdisturbed ہوتی۔ شیخ مجیب صاحب کو ان کے گھر سے گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے آیا گیا۔ بھٹو صاحب واپس پہنچے تو آ کر بیان دیا کہ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا۔(شاید وہ صرف اپنے آپ کو پاکستان کا وفادار سمجھتے ہوں) فوج نے resistance کو crush کرنا شروع کر دیا۔ جنرل ٹکا خان ڈھاکہ گئے اور فرمایا کہ انہیں زمین چاہیے۔ آدمی نہیں چاہیں۔اس وقت یحییٰ خان ملک کے صدر اور فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ لوگوں کوControled Media کی بدولت صحیح صورت حال سمجھ نہ آتی تھی۔ آتی بھی تو کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ملک شمیم اشرف صاحب نے اپنے 15-20 ساتھیوں کے ساتھ مال روڈ پر جلوس نکالا تو گرفتار کر لیے گئے۔ اور کوئی نہ بولا۔ مشرقی پاکستان میں ایک مسلح تنظیم مکتی باہنی بن چکی تھی اور فوج کے

خلاف برسرِ پیکار تھی۔ مغربی پاکستان میں مایوسی کی فضا تھی۔ ہمارے ایک دوست بنگلہ بندھو تھے۔ ملک جنگ فیکٹری اوکاڑہ میں ملازمت کرتے تھے۔ بیوی بچے ادھر نہیں تھے۔ وہ بیچارے اکیلے بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے پاس ہوٹل میں بیٹھنے آجاتے۔ ہم لوگ شرمندگی کی وجہ سے ان سے آنکھیں نہیں ملا پاتے تھے۔ Fall of Dhaca سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لوگ ایک دوسرے سے یہی پوچھتے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہو گا؟

اب ہندوستانی فوج بھی اپنے بارڈر پر پہنچ گئی تھی۔ اپنے بارڈ کی حفاظت کے ساتھ مکتی باہنی کی مدد کرتی ہوگی۔ مغربی پاکستان سے ہر قسم کا رابطہ کٹ چکا تھا۔ امریکہ کا گیارواں بیڑا خلیج بنگال میں پہنچ چکا تھا۔ لوگ اب امریکہ سے امیدیں وابستہ کرنے لگے۔ لیکن وہ fishing کے بعد واپس چلے گئے۔ اب قتل عام شروع تھا۔ Russians نے Helicopters دیئے اور ہندوستان نے ڈھاکہ میں اتار دیئے۔ پاکستانی فوج نے Surrender کر دیا۔ پاکستانی فوج کے ڈھاکہ میں سربراہ جنرل ٹائیگر نیازی تھے۔ کچھ لوگوں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر surrender کی فلم دیکھی۔ انہوں نے بتایا کہ surrender کے وقت ایک بنگالی نے ٹائیگر نیازی کے سر پر جوتی ماری۔ جنرل فرمان علی اس کے سیاسی مشیر تھے۔ کتنی بے شرمی کی بات تھی کہ مشرقی پاکستان میں شکست کے بعد بھی وہ اپنے تئیں یہ سمجھتے تھے کہ وہ پاکستان کے مسائل کو حل کرنے کے اہل ہیں اور اوکاڑہ سے 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن میں قومی اسمبلی کی نشست کے لیے کھڑے ہو گئے۔ افسوس کہ لوگوں نے اہل نہ سمجھا میاں زمان سے ہار گئے۔

ڈھاکہ میں surrender کے بعد 92 ہزار مغربی پاکستان کے فوجی

جنگی قیدی بن گئے۔ UNO میں جنگی قیدیوں کے مسئلے پر بحث کے لیے پاکستان کے foreign منسٹر S.M. Zafer اس نازک صورت حال میں پاکستان کے UNO میں case کی نمائندگی کے اہل نہ تھے۔ تو بھٹو صاحب کو بھیجا گیا۔ مگر Poland نے Right of Self determination کے اصول پر مبنی بنگال کو علیحدہ ملک تسلیم کئے جانے کے لیے resolution پیش کر دی۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ پاکستان کو توڑنے کی سازش کی گئی ہے۔ انہوں نے قرار داد کو پھاڑ دیا۔ اور جنرل اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئے۔ بنگلہ دیش معرض وجود میں آ گیا۔ بنگال میں Chaos تھا۔ Law & Order بالکل ختم تھا۔ خالد عزیز عرف جگو بنگال میں chaos کے دنوں میں چٹا گانگ merchant navy کے سکول میں داخل تھا۔ واپسی پر اس نے چشم دید واقعات سنائے۔ 1947ء والے پنجاب کا نمونہ تھے۔ پنجاب وحشی پن میں سب سے آگے ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُن کے principal لاہور کے رہائشی کموڈور شیخ محمد انور سمجھدار انسان تھے۔ انہوں نے ہوسٹل کو تالے لگوا دیئے۔ نہ کسی کو اندر آنے دیا نہ کسی بنگالی لڑکے کو باہر جانے دیا۔ اسی لیے ہم زندہ بچ گئے۔ ورنہ ناممکن تھا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کیا گیا تاکہ Law & Order بحال ہو۔ بعد میں شیخ صاحب کو بنگالی فوجی افسران نے قتل کر دیا۔ اور حکومت پر قابض ہو گئے۔

بھٹو صاحب امریکہ میں ہی رہے۔ یحییٰ خان کو فارغ کر کے ملک پر ایک نیا فوجی group قابض ہو گیا۔ گل حسن وغیرہ نے بھٹو کو بلایا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر Civilian بنا کر دوسرے دھڑے کے 4-5 جرنیلوں کو ریٹائر کر دیا۔ بھٹو صاحب کے مشورے سے مغربی پاکستان نے Muslim Bengal کو ایک علیحدہ ملک ”بنگلہ دیش“ تسلیم کر لیا۔ اندرا گاندھی وزیر اعظم

India نے کہا ''دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں ڈوب گیا۔ زیڈ اے سلہری جو سینئر صحافی تھے اور پاکستان کے زبردست حامی۔ ان کی بیٹی سارا سلہری کی کتاب (Meatless Days) میں لکھا ہے کہ ان کے والد کا زندگی بھر کا اہم واقع یہ تھا کہ وہ England میں جناح سے ملے تھے۔ وہ بھی آخر بیچارے دو قومی نظریہ کے خاتمہ کو تسلیم کرنے لگے۔(Editorial) مگر افسوس کہ زعماء نے کبھی گریبان میں نہ جھانکا۔ بچے کھچے کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی۔ تاریخ سے کبھی سبق نہ سیکھا۔ صرف عارضی حل کی تلاش میں رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انہیں پاکستان میں بسنے والے انسانوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ پاکستان میں ذرائع کی تو کمی نہیں تھی۔

اب بھٹو صاحب اکثر بیان دیتے کہ Transfer of Power کی جائے۔ عوام کی نمائندگی اب پیپلز پارٹی کے حق میں ہے۔

لاہور میں جنگی قیدیوں کے کنبے (بچے عورتیں بوڑھے) جلوس نکالنے لگے'' کہ ہمارے ابو کو لاؤ'' پاکستانی عوام اور فوج کا Morale گر چکا تھا۔ اب Transfer of Power ہوگئی۔ بھٹو صاحب نے حکومت بنالی۔ وزارتیں بن گئیں۔ اب ہندوستان جانے اور قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ حل کرنا بڑا کام تھا۔ چالیس لوگوں کا وفد بنایا گیا۔ جس میں حضرت جوش، فیض احمد فیض صاحب اور بے نظیر بھٹو کے علاوہ دوسرے اخبار نویس اور دانشور شامل کیے گئے۔ ہمسایوں کی طرح رہنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کدورتیں ختم کرنے کی بات ہوئی تو کشمیر کا جھگڑا سامنے آیا۔ طے پایا کہ Kashmir Issue کو UNO سے اٹھا لیا جائے اور آپس میں بیٹھ کر بات چیت سے طے کرلیا جائے۔ شملہ میں بیٹھ کر اس معاہدے پر دونوں فریقوں کے دستخط ہوگئے۔ جسے شملہ معاہدہ کہا

گیا۔ اس طرح کچھ لو اور کچھ دو کی بناء پر 92ہزار جنگی قیدی چھڑا لائے۔ پھر ایٹمی قوت بننے کا سوچا، جس کی وجہ سے امریکہ سے تعلقات خراب ہو گئے۔

شیخ محمد رشید (بابائے سوشلزم) وزیر صحت بنے۔ شادمان کے پوش ایریا میں کوٹھی بنالی اور نئی شادی کر لی۔ اب لائلپور سے خبریں آنے لگیں کہ مختار رانا اور بھٹو صاحب کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں۔ میں اور نصیر مختار رانا سے ملنے لائلپور گئے۔ ان کے اڈے پر پہنچے تو پتہ چلا کہیں اور ہیں۔ وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ کسی اور جگہ پر ہیں۔ اس جگہ پر پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ فلاں جگہ پر ہیں۔ آخر ہمیں ایک Parachute کی گانٹھوں کے گودام میں ملے، جو دوکانوں کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔ وہ گانٹھوں پر بیٹھے کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ ہم بھی گانٹھوں پر ہی بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا تعارف پیپلز پارٹی اوکاڑہ سٹی صدر کا کروایا۔ اس کے بعد میں نے Pre partition refrence دیا۔ دراصل مختار رانا بھی میرے گاؤں اور برادری سے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ ''ذیلدار والا کنبہ؟''۔ میں نے کہا ''جی ہاں''۔ انہیں مجھ سے مل کر بہت خوشی محسوس ہوئی۔ میری بیوی کے ماموں بھی لگتے تھے۔ وہ فوراً ہی کھل کر دل کی باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ بھٹو صاحب نے شیخ رشید کو کہا کہ جب تک تم Power شو نہیں کرو گے۔ فوجی Transfer of Power نہیں کریں گے۔ تم Communist ہو۔ تم نے لوگوں میں کام کیا ہوا ہے۔ اپنی طاقت دکھاؤ۔ شیخ رشید نے مختار رانا کو مظاہرے کرنے کو کہا۔ لائلپور میں ہی کام کیا ہوا ہے۔ ہم نے اپنا کیا ہوا کام دکھا دیا ہے۔ (انڈسٹری اور سرکاری دفاتر پر قبضہ) شیخ صاحب اب وزیر بن بیٹھے ہیں۔ ہم نے تو لوگوں سے وعدے کیے ہوئے ہیں۔ اس پر پکے ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ بھٹو بڑا کینہ پرور ہے۔ چاہے ہمارے

بچے مار دے۔ ہم تو وعدوں پر پکے ہیں۔ اب ختم کرے جاگیرداری۔ میں نے کہا کہ اگر راؤ خورشید علی ساتھ آ جائیں! پھر تو ہم آدھی سے زیادہ بازی جیت جائیں گے۔ ہم نے اوکاڑہ واپس آکر راؤ صاحب کو سارا مسئلہ بیان کیا۔ راؤ صاحب نے اتفاق کیا۔ ہم بھی ساتھ ہیں۔ آخر لوگوں سے وعدے کیے ہیں۔ پورے کرنے پڑیں گے۔ ایک گروپ بننا شروع ہوگیا۔ سرحد سے خالق خاں، پنجاب سے راؤ خورشید علی، مختار رانا، سندھ سے معراج محمد خاں اکٹھے ہوگئے۔ دوسری دفعہ محلّہ مائی کی جھگّی جلسہ (اکٹھ کیا) کیا۔ جس میں لائلپور کی Trade Unions اور پارٹی ورکرز نے حصہ لیا۔ دری بچھا کر نیچے ہی بیٹھے تھے۔ کوئی Stage نہیں تھا۔ میں اور نصیر اوکاڑہ سے شامل ہوئے۔ ہمارے علاوہ صرف پیپلز پارٹی جھنگ شہر کا صدر تھا۔

لائلپور میں چھوٹی صنعتیں اور ان کی Trade Union بہت ہیں۔ اس رات میٹنگ میں 5000 ورکرز اور ٹریڈ یونین کے عہدیداران نے مختار رانا کو وفاداری کی یقین دہانی کروائی۔ صرف یونین کے صدر اور سیکرٹری آکر کہتے ''ہماری فلاں ٹریڈ یونین ہے اور ہم رانا صاحب کے ساتھ ہیں۔'' میں نے اپنا اور نصیر کا تعارف کروایا کہ نصیر طالب علم رہنما اور میں اوکاڑہ شہر کا صدر ہوں۔ ہم اور ورکرز آف اوکاڑہ مختار رانا کی حمایت کرتے ہیں۔ یقین دہانی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اسی طرح جھنگ کے صدر نے کہا۔ رات بہت گزر چکی ہے پھر رانا صاحب کو کہا کہ اپنے خیالات سنائیں۔ وہ پنجابی زبان میں تقریر کرتے ہیں۔ جس میں کوئی پھول پتیاں نہیں ہوتیں۔ مزدوروں کے حقوق کے بارے میں جذباتی ہوگئے۔ ہم نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ مزدوروں کی طاقت کیا ہوتی ہے۔ ٹوبہ کانفرنس کا جذبہ اور تھا۔ وہ دل کو بھرما دینے والا تھا۔ یہاں مزدور

Calculating تھے۔

کوثر نیازی اور حنیف رامے نے لائلپور کے ایک سینما ہال میں ورکرز کو خطاب کیا اور کہا مختار رانا Leu Shao Chi ہے۔ (گویا بھٹو ماؤ) خوب مسخرے (Mimics) ہیں یہ لوگ۔ پھر محترمہ زرینہ رانا صاحبہ، مختار رانا کی بہن ، جو خود بھی ایک انقلابی خاتون ہیں اور ان کا اپنے علاقے کے مزارعین میں کافی کام ہے۔لائل پور سے الیکشن میں کھڑی ہوئیں۔ الیکشن کے Result کا تو پہلے ہی پتہ تھا۔ ہرایا جانا تو سب پر واضع تھا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ عوام سے کیے گئے وعدے حکمرانوں کو دیا دلائے جائیں۔ حضرت امام حسینؓ نے جیسے سکھایا ہے۔ یہ بات قربانی کی زبان میں ہی کہی جاسکتی ہے۔ پھر مختار رانا پر ایک (جھوٹا مقدمہ بنواکر) چار سال کے لیے بند کردیا گیا۔" چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا"۔ مختار رانا کی ساری زندگی کی محنت Trasfer of power کے لیے صرف ہوگئی۔ دوستوں سے سنا ہے کہ بھٹو صاحب نے مختار رانا کے بارے میں کہا۔ Amateurs of politics مختار رانا معاشی طور پر تباہ ہوچکے تھے۔ اپنا کالج چلانے کے قابل بھی نہ رہے۔ England چلے گئے اور چھوٹی موٹی ملازمت اختیار کرلی۔ ان کی بیگم ڈاکٹر تھیں وہ پاکستان میں اپنے بچوں کو تعلیم دلاتی رہیں۔

اب ذرا پیچھے نظر گئی تو بہت سے دوست یاد آئے۔ جو Disillusion ہوگئے۔ اور ٹوٹا ہوا خواب لے کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے کنونشن کے صدر جناب اسلم حیات ایڈووکیٹ اور Stage Secretary محترم ملک حامد سرفراز (گوالمنڈی رہائش) نے جلد ہی استعفےٰ دے دیا۔ انہیں بھٹو صاحب کا سٹائل پسند نہ آیا۔ جسے لوگ عوامی یا populist کہتے تھے۔

دراصل وہ highbrow اور romantic تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ عوام کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ ملک حامد سرفراز، شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ میں شامل ہوگئے۔ ان کا فیصلہ کتنا صحیح تھا اور نظر دور رس۔ Secularism اور Fareism کے بغیر نہ جمہوریت بچ سکی نہ ملک اس کے بعد محترم جناب جے اے رحیم صاحب ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ پارٹی کو inspiration دینے والے تھے۔ وہ پارٹی کے Secretary General تھے۔ سنا ہے انہیں تو پٹوایا بھی گیا (بحوالہ Clash of Fundamentlists مصنف طارق علی)۔ راولپنڈی کے صدر خورشید حسن میر بھی چھوڑ گئے۔ تاج محمد لنگاہ بار ایٹ لاء بھی چھوڑ گئے۔ وہ بہت ہی سرگرم اور تعلیم یافتہ کارکن تھے۔ 1970ء کے الیکشن میں انہیں ممتاز دولتانہ کے خلاف ٹکٹ دی گئی جو دولتانہ صاحب کی خاندانی سیٹ تھی۔ تاج صاحب کا کہنا تھا کہ اس نے بارہا بھٹو صاحب سے Request کی ایک دفعہ اس حلقے کا دورہ کریں۔ مگر ۔۔۔ انکا کہنا تھا کہ انہیں جان بوجھ کر ہروایا گیا تھا۔ وہ Citisim میں یقین رکھتے تھے جو بھٹو صاحب کو پسند نہ تھا۔ وہ میرے الیکشن 1977ء میں اوکاڑہ campaign کے لیے تشریف لائے۔ Disillusined person کے طور پر کچھ عرصہ پارٹی میں رہے۔ مگر پھر پارٹی چھوڑ گئے۔ معراج محمد خان بہت بڑے انقلابی تھے تمام عمر اسی میں گنوائی۔ بھٹو صاحب ان کو اپنا جانشین کہتے تھے۔ جیل میں ان کی بینائی بھی کمزور ہوگئی۔ وہ بھی چھوڑ گئے۔ رسول بخش تالپور صاحب بھی وعدوں کے مسئلے پر چھوڑ گئے۔

ملک معراج خالد پر بھٹو صاحب اعتبار نہیں کرتے تھے portfolio کے باوجود powers نہیں دی تھی۔ وہ کچھ کر نہیں پاتے تھے۔ مگر ملک صاحب بھی بہت سخت جان آدمی تھے اور انکا بات کہنے کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ انہوں

نے کبڈی کے میچ کروائے اور پورا پورا کبڈی کا میچ دیکھا۔ یہ کہنے کے لیے کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں۔ ضلع ساہیوال کے ورکرز convention میں ملک صاحب بھٹو کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جب تقریر کی باری آئی تو وہیں سے اٹھ کر بولنا شروع کیا اور کہا کہ ہم پیپلز پارٹی والے جاگیرداری کو ختم کردیں گے، تاکہ عوام کی بنیادی ضرورتیں (روٹی کپڑا مکان) پوری ہوسکیں۔ بھٹو صاحب نے گردن موڑ کر ملک صاحب کی طرف ایسے غصے سے دیکھا، جیسے اٹھا کے باہر پھینک دیں گے۔ کھانے کی میز پر صرف سردار علیم کو بٹھایا۔ حالانکہ سبھی موجود تھے۔ملک صاحب کوئی موقع ملے ہاتھ ضرور دکھاتے تھے۔ میں نے یہ بات ملک معراج خالد صاحب سے سیکھی کہ موقع پر اپنی بات کہہ جاؤ۔ لوگوں کو اپنے لڑکپن کی باتیں سناتے رہتے۔ آخر میں یہ بات کرتے کہ پیپلز پارٹی جاگیرداری کو ختم کردے گی۔ کوئی چپ نہ کروا سکا۔ یہ انوکھا طریقہ واردات انکی ایجاد تھی۔

گورنر پنجاب بننے کے بعد مصطفےٰ کھر نے پنجاب پولیس کے بارے میں سخت رویہ اپنایا۔ لاہور میں لڑکیوں کو اٹھانے کے ایک دو واقعات ہوئے کھر نے سختی دکھائی تو دو دن میں لڑکیاں برآمد ہوگئیں۔ پولیس کو efficiency دکھانی پڑی جس کی وہ عادی نہیں تھی۔ لہذا پولیس نے عاشورہ کے نزدیک ہڑتال کردی۔ان کا خیال تھا کہ پولیس کی غیر موجودگی میں شیعہ سنی جھگڑا ہو جائے گا۔ لہذا سعید منٹو، انور پاشا، مشتاق بھٹی اور میں ہم چاروں امام بارگاہ میں چلے گئے۔ جلسوں میں ماتم کرتے رہے۔ اور گول مسجد کے نزدیک پہنچ کر (خطرناک جگہ جھگڑے کے لیے) میں نے ذوالجناح کی باگ تھام لی اور ماتم کرتا ہوا خطرے والا علاقہ طے کرلیا۔ اوکاڑہ کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی امن بحال رہا۔ پولیس گھٹنے ٹیک گئی اور وہ واپس ڈیوٹی پر آنے لگی۔ گورنر کی

پوزیشن مستحکم ہوگئی۔

پولیس ہڑتال کے ناکام ہونے کے بعد وہ گورنر کے عہدہ کو ذاتی ملکیت سمجھنے لگے اور ایک گروپ بنالیا۔ ضلع ساہیوال سے رائے میاں خاں اور نذر منصور ان کے دھڑے میں چلے گئے۔ رائے میاں خاں نے اس opportunity کو بہت avail کیا۔ انہوں نے اپنے علاقہ میں 14 سکول بنوائے اور بے شمار سڑکیں۔ جس میں 1857ء کے مجاہد آزادی شہید رائے احمد خاں کھرل کا مقبرہ بھی شامل ہے۔ راوی کے علاقے میں مقبول ہوگئے مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ میں ساہیوال میں بلدیہ ساہیوال کے ساتھ پولیس چوکی کی حوالات میں بند تھا۔ جب راؤ عبدالستار نے مجھے یہ خبر سنائی۔ (بھٹو صاحب کے غائبانہ جنازے کے بعد مجھے گرفتار کیا گیا تھا) ہمیں بہت ہی دکھ ہوا۔ رائے میاں خاں ہمارا غریب ورکر ساتھی تھا۔ نذر منصور نے صرف موج اڑائی۔

حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب بنے۔ انہوں نے بھی ایک گروپ بنالیا۔ ان دھڑوں میں زیادہ تر برادری کا حوالہ تھا۔ رامے صاحب نے بعد میں ایک کتاب ''پنجاب کا مقدمہ'' نامی لکھی جس میں پنجابی فلموں کی کہانیوں سے استعفادہ کر کے پنجاب کے ہیروز کی کردار نگاری کی۔ یہ دونوں حضرات پنجاب کی سربراہی کے candidate تھے۔ انہوں نے پارٹی کو نقصان پہنچایا۔ بھٹو کی نظروں میں گر گئے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکے۔ رامے صاحب نے پارٹی عہدیداروں (صدر۔ سیکرٹری) کی لاہور اسمبلی کے second floor کے ایک بڑے کمرے میں میٹنگ بلائی اور openly پوچھا کہ کسی کو کوئی کام ہو تو بتائیں۔ کچھ لوگوں نے کار کا پرمٹ، ٹریکٹر، کسی عزیز کی نوکری وغیرہ کے لیے اٹھ کر کہا۔ ساہیوال کے صدر خواجہ عسکری حسن بھی تھے۔ انہوں نے شعر پڑھا

جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے
تو بوجھ اتارا کرتے ہیں

پیپلز پارٹی کی حکومت نے بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اس کے بعد گھی ملوں، آئل ملوں، جننگ فیکٹریوں، چاول چھڑنے کے کارخانوں، فلور ملوں جن میں چھوٹی چکیاں زیادہ تعداد میں تھیں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا۔ اس سے پارٹی بہت غیر مقبول ہوئی۔ پارٹی کی عقل سمجھ کا مذاق اُڑنے لگا۔

زرعی اصلاحات کی گئیں مگر کسی بے زمین مزارع کو زمین نہ ملی۔ بٹائی کے نظام میں کھاد اور بیج مالک زمین کو ادا کرنا تھا۔ جو ایک جائز بات تھی۔ مگر یہ عملاً نافذ نہ ہوا۔ کیونکہ مالک اور مزارع کی لڑائیاں ہونے لگیں اور کرپٹ افسر شاہی کی موجودگی میں مزارعین کے جھولی میں اصلاحات کا پھل نہ پہنچ سکا۔ مالکان نے زمین پٹہ پر دینی شروع کردی۔ اور غریب مزارعین کو جو ٹھیکہ کی رقم ادا نہ کرسکتے تھے۔ انہیں بہت Hardship کا سامنا ہوا۔

Corrupt افسر شاہی کی وجہ سے کوئی اصلاحات کامیاب نہیں ہوسکتیں اور نہ غریب لوگوں کو قانون کا تحفظ مل سکتا ہے۔ جو حکمران اس مسئلے کو حل نہیں کرتے وہ بڑے بڑے پروگراموں کے Packages دے کر عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔ معاشرے میں Corruption اور Alienation کا ایک بڑا سبب یہی عنصر بنا ہے۔ اسمبلیوں میں بیٹھے امیر لوگ۔ غریب کے Culture اور مسائل کو نہیں جانتے۔

غریب مزارعین اور مزدوروں کی توقعات کو ہم نے ووٹ لینے کے لیے بھڑکایا۔ اب ہم شرمندہ تھے کہ ہم ان سے وعدے پورے کرنے کے قابل

نہیں ہیں۔ سادہ لوح غریب یہ توقع لیے ہوئے تھے کہ یہ کوٹھیاں اور زمینیں بھٹو انہیں دیدے گا۔ خواب ٹوٹنے پر بہت سے لوگ پچھتائے۔ مگر ایسے لوگ بھی ہیں جو بغیر کسی صلے کے سچائی اور انسانیت کے نام پر پیپلز پارٹی کے ساتھ ملے (مسلم شیخ برادری) کے ایک بھٹہ مزدور سے میری بات ہوئی، اس نے مجھے بتایا۔ کہ نہ ہمیں آج تک کسی نے کچھ دیا ہے، اور نہ دینا ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ بھٹو نے ہمیں انسان تو سمجھا۔ ہم اسی لیے اس کے پیچھے ہیں۔

پارٹی پر جاگیرداروں کا قبضہ ہے۔ مگر یہ لوگ کھالے کے نکال کی طرح انہیں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی نمائندہ نہیں نہ ان کی کوئی آواز سننا چاہتا ہے۔ ریڈیو آن کر کے اینٹیں پتھتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے لیے موسیقی انہیں خیالی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔

5 مرلہ سکیم سے دیہاتوں میں غریب لوگوں کو اپنا مکان بنانے کا موقع مل گیا۔ اس سے جو ان سے بیگار لی جاتی تھی اس میں فرق آیا۔ اُمرا کو شکایت ہے کہ نوکر نہیں ملتا بھٹو نے لوگوں کو خراب کر دیا ہے۔

Majority or showing of Strength دِکھانے کے لیے populism ایک طریقہ ہے۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے اسے Introduce کروایا۔ اور اب یہ تمام پارٹیوں نے اپنا لیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ عوام کو سیاسی بنیادوں پر منظم ہونے کا موقع نہ ملا تاکہ وہ ایک سیاسی قوت بن پائیں۔ کبھی کسی کو صوبے کا صدر Nominate کر دیا۔ کسی کو جنرل سیکرٹری بنا دیا، پارٹی میں کبھی seriously الیکشن نہ کروائے گئے اور نہ کبھی عوام میں منشور پر غور و فکر کی عادت ڈالی گئی۔ بس لیڈر ہی سب کچھ ہے۔ اسی کی تعریف ہوتی رہتی۔ اسے ہی کرشمہ کہا جانے لگا۔ کبھی غلطیوں کا

جائزہ نہ لیا گیا۔ پارٹی ورکروں کا کام غلطیوں کو justify کرنا بن گیا۔ پارٹی meeting ہمیشہ uncontroled رہتی اور ہلکی پھلکی ہلڑ بازی پر ختم ہوتی۔ تنقیدی جائزہ کو واہیات چیز سمجھا جاتا۔ میلا سا لگا رہتا۔ اس طرح کی باتیں کہ اوپر سے ایک آدمی کو ہٹانے سے پارٹی ختم ہو سکتی ہے۔ ہونے لگیں، بھٹو صاحب کی شہادت کے بعد ''بے نظیر بھٹو کی تصویر'' کا نعرہ دیا گیا۔ بھٹو کے وارث عوام کو ہٹا کر خاندانی سیاست شروع ہوگئی اور وہی populist سٹائل جاری رہا۔ راجہ انور غائب ہوگیا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ جیل سے فارغ ہوکر راجہ انور کے رول پر سوال اٹھاؤں گا۔

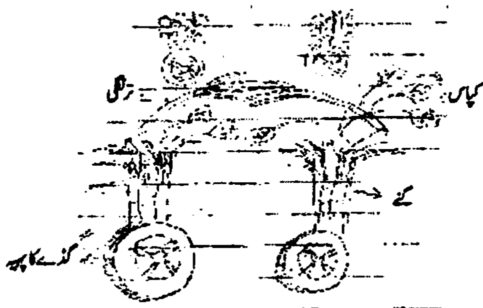
اب 1977ء کا الیکشن نزدیک آنے لگا۔ پارٹی کی مقبولیت کا گراف جوں کا توں رہا۔ مگر سیٹوں کے لیے دوڑ دھوپ دکھائی پڑنے لگی۔ اوکاڑہ میں 1970ء والے الیکشن میں پارٹی پر قبضہ کرنے کی کوشش میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ (جو NAP سے پیپلز پارٹی میں آئے تھے اور پارٹی کے نائب صدر تھے) کے group نے کی مگر ناکام ہوئے۔ اس الیکشن میں حنیف رامے اور راؤ عبدالستار لیڈر آف سینٹ ٹکٹیں چھیننا چاہتے تھے۔ انہوں نے سکیم بنائی کہ اوکاڑہ میں بھٹو صاحب کے جلسہ میں ان کے اپنے candidate پارٹی میں شمولیت کا اعلان کریں گے اور انکا image ابھارنے کے لیے ان کے 500 followers بھی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کریں گے۔ اور stage پر ان کے لیے کرسیاں رکھیں جائیں۔ اس کے لیے انہوں نے اوکاڑہ میں پارٹی کارکنوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں پہلے راؤ عبدالستار پارٹی دفتر وینس چوک آئے اور کارکنوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور وعدہ کیا کہ جو کارکن کہیں گے وہ ہی ہوگا۔ پھر حنیف رامے خود ریسٹ ہاؤس میں آئے اس کے

بعد حنیف رامے گروپ کے وزیر ڈاکٹر صادق ملہی دو دفعہ آئے۔ مگر کارکنوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ کارکنوں کا کہنا یہ تھا کہ ہر کوئی پارٹی کا 4 آنے کا ممبر بن کر ہماری طرح آئے۔ پھر ترقی کر کے چاہے وزیر بنے یا گورنر بنے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس طرح ہیلی کاپٹر کے ذریعے اوپر سے پارٹی پر نازل ہونے کو ہم نہیں تسلیم کرتے۔ ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے نمائندے موجود تھے۔ چوہدری سعید، عالم شیر، میں اور امین فاروقی ایڈووکیٹ بھی موجود تھے۔ شیخ ریاض ممبر صوبائی اسمبلی نے مجھے کہا کہ کارکنوں کو سمجھاؤ جو کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نہیں سمجھا سکتا۔ آپ صوبائی اسمبلی کے ممبر ہیں آپ سمجھائیں۔ باہر کارکنوں کا مجمع اور ان کا بزرگ امین بادشاہ تھا۔ کون انہیں سمجھا سکتا ہے۔ صرف حاجی صادق ربیرا ممبر قومی اسمبلی ہی ہم کارکنوں کے ساتھ تھے۔ باقی تمام نمائندے وزیر صاحب کے ساتھ۔ اور کہہ رہے تھے کہ پارٹی کو بڑھنا چاہئے اور لوگ شامل ہوں تو آپ کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ ایک گھنٹے کی بحث تکرار کے بعد۔ کسی فیصلے کے بغیر میٹنگ ختم ہوگئی۔ انہوں نے کہا stage پر کرسیاں تو رکھیں جائیں گی۔ اوپر کسی کو بیٹھنے دینا یا نہ دینا کارکنوں کی مرضی ہے۔ بھٹو صاحب کا یہ جلسہ 1977ء کے الیکشن کی تیاری کے سلسلے میں اوکاڑہ شہر کے قبرستان سے ملحقہ سٹیڈیم میں ہوا تھا۔

جلسے کی تیاری شروع ہوگئی ہم کارکنوں نے ملٹری دودھ فیکٹری سے دروازے بنانے شروع کیے (جہاں اوکاڑہ شہر کی حدود ہے) اور آخری دروازہ جسے میں نے اور منشی شریف نے بنایا تھا وہ جلسہ گاہ کے سامنے نصب کیا گیا تھا۔

بھٹو صاحب نے گیمبر چھاؤنی میں ہیلی کاپٹر سے اترنا تھا اور وہاں

سے کار کے ذریعے جلسہ گاہ پہنچنا تھا۔



(تصویر اسی دروازہ کی ہے جو میں نے ڈیزائن کیا تھا)

ترنگلی: کسان کی سوکھی ہوئی انگلیوں والا ہاتھ ظاہر کرتی ہے۔

گویا زراعت کا پہیہ چلانے والے کے ہاتھ خالی ہیں۔

بڑی stage پر جو کرسیاں پڑی تھیں ان پر قومی وصوبائی اسمبلی کے ممبران بیٹھے تھے۔ پارٹی کے صرف ایک غریب کارکن مولانا صاحب (سندھی محلے والے) تلاوت قرآن پاک کے لیے سٹیج پر موجود تھے۔ مگر ان سے تلاوت کروانے کی بجائے محمد یار لاشاری نے جو اس وقت ممبر صوبائی اسمبلی تھے خود ہی تلاوت کردی۔ ہم کارکن لوگ چونکہ پارٹی میں نئے لوگوں کو شامل کرنے کے طریقہ کار کی وجہ سے ناراض تھے۔ اس لیے انتظامات کرنے کے بعد stage کے سامنے نہ بیٹھے۔ میں اور عالم شیر آلوؤں کے کھیت میں جا کھڑے ہوئے نتیجتاً جماعت اسلامی کے کارکن سٹیج کے سامنے قابض ہوگئے۔ بھٹو صاحب نے تقریر شروع کی تو انہوں نے جوتے دکھانے شروع کردیئے۔ بھٹو صاحب گھبرا گئے اور کہا کہ ہاں ہاں جوتے مہنگے ہوگئے ہیں۔ اور اس کے بعد تقریر بالکل مختصر کرکے بیٹھ گئے۔ جلسہ ختم ہوگیا۔ راؤ رشید اس وقت ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو تھے۔ انہوں نے ''جو میں نے دیکھا'' نامی کتاب لکھی ہے اور اس میں

اوکاڑہ کے اُس جلسے کا ذکر کیا ہے۔ مگر وہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

دوسرے دن ساہیوال کا جلسہ تھا۔ عسکری حسن ساہیوال کے صدر تھے۔ وہاں کوئی جھگڑا نہیں تھا جلسہ کامیاب ہوگیا۔ جلسہ کے بعد بھٹو صاحب نے کارکنوں سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ نے کل والی کمی پر قابو پالیا ہے امین فاروقی ایڈووکیٹ اوکاڑہ نے بھٹو صاحب سے کہا کہ اوکاڑہ پیپلز پارٹی کی طاقت کچی آبادیاں ہیں۔ انہیں مالکانہ حقوق دیے جائیں۔ بھٹو صاحب نے جواب دیا کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں صرف آپ کا گھر پکا ہے۔ پھر ہنسے اور کہا۔ کہ لوگوں کو تسلی دیں۔ کوئی اُنہیں اٹھا نہیں سکتا۔ تھوڑے وقت کی ضرورت ہے۔ ساہیوال کے کارکن ممتاز حکیم موجود تھے۔ مجھے بہت افسوس ہے (اب تک) کہ حنیف رامے (اچکن پہنے بھٹو صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا) ہی تو دراصل اوکاڑہ کے جلسے کی ناکامی کا ذمہ دار تھا۔ ہم اس وقت یہ بات منہ پر نہ کر سکے۔ ہم جھجک گئے یا کچی بستیوں کے مسئلے نے ہمارے دماغ پر قبضہ قائم رکھا۔ اب بھی سوچتا ہوں کہا ہوتا۔ تو بات واضح ہوجاتی سمجھ نہ آسکا کہ کس کو ٹکٹ دلوانا چاہتے تھے؟ اور کس کو promote کررہے تھے؟

ایک اور کوشش بھی اسی سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ ٹکٹ کے حصول کے لیے راؤ غلام مصطفیٰ صاحب Potato Society والے کے زیر اہتمام وزیر اعلیٰ پنجاب صادق قریشی صاحب کو Okara آنے کی دعوت دی گئی۔ جس کا اہتمام کمپنی باغ اوکاڑہ میں کیا گیا تھا۔ تمام علاقے کے معتبر لوگوں کو invite کیا گیا تھا۔ جناب صادق قریشی سٹیج پر آئے اور تقریر کرنے لگے تو شہد کی مکھیاں انکے سر پر منڈلانے لگیں۔ تقریر بند کی اور کار میں بیٹھ گئے۔ جلسہ ختم ہوگیا۔ میں اور شیخ ریاض stage کے سامنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

''ملنگا! ایہہ کیہ ہویا؟'' میں نے کہا کہ قرآن شریف میں جن ابابیل کا ذکر ہے۔ یہ بھی وہی ہیں۔

اوکاڑہ میں غریب کارکنوں نے دو حملے (ٹکٹوں کے لیے) سخت جدوجہد سے ناکام بنائے۔ تیسرا حملہ خدائی رحمت سے ناکام ہوا۔ یہ ہی مفہوم ہے۔ اس قرآن کریم کی آیت کا۔ کہ خدا patience سے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(ان اللہ مع الصابرین)

راؤ خورشید علی اسمبلی میں بھٹو صاحب کی پالیسیوں کی ڈٹ کر مخالفت کرتے تھے۔ اکثر اوقات BBC کی خبروں میں بھی راؤ خورشید علی کی تنقید کا ذکر آتا۔ کئی پارٹی کارکن راؤ صاحب پر تنقید کرتے کہ اپنی ہی پارٹی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم چپ رہتے۔ کوئی reaction نہ دکھاتے۔ پھر قومی اسمبلی میں opposition نے procedings کا بائیکاٹ کردیا۔ بھٹو صاحب کے پاس majority تو تھی ہی مگر راؤ خورشید علی کی تنقید کی بدولت assembly میں Law Making کا عمل healthy اور متوازن رہا۔

بغیر پرکھے Uncriticised بل پاس تو ہو سکتے تھے۔ مگر ڈکٹیٹرشپ کی بو آتی تھی۔ اور بہت ہی گھٹیا Convention معرض وجود میں آجاتی۔ Opposition کے role کو deny کرنے سے جمہوریت کی روح ہی ختم ہوجاتی ہے۔ جمہوریت مہذب انسان کا بنایا ہوا ادارہ ہے۔ جس میں تنقید اورمکالمے کو ایک مثبت ہتھیار تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم بھٹو صاحب اور 70ء کی اسمبلی کا اہم کارنامہ ملک کو ایک متفقہ آئین دینا ہے۔

بھٹو صاحب راؤ خورشید کے بڑے معتقد ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ راؤ صاحب میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ سب سے پہلے ٹکٹ آپ کو

دونگا۔آپ پارٹی کے بزرگ ہیں۔راؤ خورشید بھٹو سے بہت شاکی تھے۔کہتے کہ" وہ" چاہتا ہے کہ میں ٹکٹ کے لیے apply کروں اور وہ refuse کر دے۔تا کہ میں لالچی آدمی ثابت ہو جاؤں۔

اب 77ء کے الیکشن کے لیے باقاعدہ ٹکٹوں کے لیے درخواستیں مانگ لی گئیں۔میری ٹکٹ کے لیے جناب امین فاروقی نے اپنی جیب سے پیسے خرچ کئے اور مرزا اکرم نے صوبائی اسمبلی کا فارم جمع کروادیا۔راؤ صاحب تو ٹکٹ لینے کے لیے راضی ہی نہ تھے۔ہم لوگوں نے سوچا کہ بات تو کریں۔لہذا میں اور نصیر ساہیوال راؤ صاحب کے گھر پہنچے۔نصیر کا خیال تھا کہ نہیں مانیں گے۔ میں نے کہا کہ argue کرتے ہیں۔ہم نے کہا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ آپ ٹکٹ کے لیے apply کریں۔"وہ کیوں؟" میں نے کہا کہ،"ناراضگی ذاتی مسئلہ تو نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ غلط بات پر اختلاف کریں۔تنقید کریں۔احتجاج کریں۔اوکاڑہ میں کارکنوں کا ایک گروپ ہے۔آپ اس گروپ کے assembly میں نمائندے ہیں۔آپ کے علاوہ کسی اور میں جرات بھی نہیں ہے کہ نمائندگی کر سکے۔اگر آپ نے کھڑے نہیں ہونا تو ہم لوگ بھی گھر بیٹھ جاتے ہیں۔وڈیروں کا چمچہ بننے کا ہمیں بھی شوق نہیں"۔ "تو پھر مثبت تنقید ہی کرنی ہے؟"۔انہوں نے پوچھا۔"جی ہاں! یہی ہمارا role بنتا ہے"۔"ٹھیک ہے میں اس کے لئے تیار ہوں۔مگر وہ ticket refuse کرکے ہمیں ذلیل کرے گا"۔ میں نے کہا کہ،" میں covering candidate بنتا ہوں تو ٹکٹ مجھے دینی پڑے گی۔ جنگ تو جاری رہے گی"۔ "ٹھیک ہے یہ خطرہ بھی مول لے لیتے ہیں۔صبح میں اوکاڑہ آجاؤں گا"۔نصیر نے راؤ صاحب کے چھوٹے بیٹے کو میلے کپڑے لانے کو کہا۔نصیر ڈبل دھلائی دے کر

تیار بھی کروا لایا۔ پھر ہم دونوں واپس اوکاڑہ آ گئے۔ صبح فارم جمع ہوگیا۔ میں نے بھی بطور کوورنگ کینڈیڈیٹ راؤ صاحب کے ساتھ قومی اسمبلی اوکاڑہ کی سیٹ کے لیے فام جمع کروا دیا۔

راؤ صاحب کو قومی اسمبلی اور مجھے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ ملا۔ مجھے اس اصول پر ٹکٹ دیا گیا۔ کہ میں اوکاڑہ میں پارٹی کا کنوینئر تھا۔ اور سب جگہ (اگر کسی نے apply کیا) تو convener کو ٹکٹ دیا گیا۔ اکرم ربانی کو ٹکٹ حاجی صادق ربیرہ نے لے کر دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اکرام کو اسلام آباد لے کر گئے تھے۔ اور سب سے ملوایا اور بتایا کہ انہوں نے خود ٹکٹ نہیں لینی۔ اکرام ربانی کو اپنی ٹکٹ دلانی ہے۔ وہ انکا بیٹا ہے۔ غلام صابر خاں نے مجھے کھڑا کیا تھا۔ مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی۔ پاکستان میں جو سمجھے کہ اس کی عزت ہے۔ وہ نہایت بے وقوف ہے۔ یہاں کسی کی عزت نہیں ہے۔ دولت کا لالچ نہیں۔ میرے پاس خدا کا دیا پہلے ہی بہت ہے اگر پیسے کی ضرورت ہوئی تو دو ایکڑ مکئی کے اور لگا لوں گا۔ وہ بات کی تہہ تک فورا پہنچ جاتے تھے۔ یہ راوی کلچر کی بدولت تھا۔ یہاں کے لوگ بہت سمجھدار ہوتے ہیں۔ میں حاجی صادق صاحب کو اپنا گرو مانتا ہوں۔ پرھیا پنچایت کے بارے میں انہوں نے مجھے بہت باتیں سمجھائیں۔ الیکشن campaign شروع ہوگئی۔ شیخ عنایت اللہ صاحب سابقہ چیئرمین بلدیہ۔ مسلم لیگ اوکاڑہ کے صدر۔ مجھ سے بیٹوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ اپنا ایک مکان خالی کروا کر الیکشن آفس بنانے کے لیے دیا۔ (میری رہائش گاؤں میں تھی) صبح کا ناشتہ، درویش طبع خاتون نذیراں بی بی (جس کی رہائش الیکشن آفس کے سامنے تھی) کے گھر سے آتا تھا۔ فرش پر صفیں بچھا لیں گئی تھیں۔ رضائیاں مرزا اکرم کے گھر سے آگئیں۔ سب کارکن

مل کر سو جاتے۔ رانا الطاف خاں کی جیپ تھی جس میں میں اور شریف حسین campaign کے لیے جاتے تھے۔

راؤ خورشید علی خاں کے الیکشن کا بوجھ کارکن برداشت کرتے تھے۔ میرے الیکشن میں بھی کارکنوں نے کافی بوجھ اٹھایا۔ فاروقی صاحب ، چاچا فضل، صادق بھٹی صاحب 5 چک ، رانا الطاف خاں اور منا پیش پیش تھے۔

دیہاتوں میں بھی پولنگ کے اخراجات وہاں کے کارکن دوستوں نے برداشت کیے۔ اس الیکشن میں چوہدریوں کے ڈیروں پر جانے کا رواج ختم ہوگیا۔ گاؤں کے چوک میں ''جاگ اٹھا ہے سارا وطن'' بجا کر ایک چھوٹی سی تقریر اور ووٹ کے لیے درخواست کرتے۔ پیپلز پارٹی کا ووٹ بنک قائم تھا۔ جتینا تقریباً یقینی تھا۔ مولانا غلام علی اوکاڑوی صوبائی اسمبلی کے امیدوار مایوس ہوگئے۔ لاہور سے بھی ایک سیٹ پر کھڑے تھے وہاں Concentrate کرنے لگے۔ وہاں بھی ناکام ہوگئے۔ اوکاڑہ میں انکی شہرت پر برا اثر اس وقت پڑا جب انہوں نے کامریڈ ملا بجنوری کا جنازہ پڑھانے سے انکار کردیا، کہ وہ کافر ہے۔ کامریڈ ملا ایک نہایت دیانتدار مزدور تھا۔ مل اور شیخ بستی (جہاں اس کی رہائش تھی) میں اس کی بہت عزت تھی۔ مزدوروں نے مولوی کو گالیاں دیں (میں بھی شامل تھا) ایک دوسرے مسلک کے مولوی نے جنازہ پڑھایا۔ شہر میں بھی چہ مگوئیاں ہوئیں۔ ہم اسکے مریدوں سے پوچھتے تھے کہ اس مولوی کو کس نے ٹھیکہ دیا ہے کہ کافر یا مسلمان ہونے کا فتویٰ دے۔ ولوں کا حال خدا جانتا ہے۔ قیامت کے دن تو مولوی کا بھی حساب لیا جانا ہے۔

الیکشن کے بعد مولویوں نے نظام مصطفیٰ کی تحریک چلائی۔ Opposition نے الزام لگایا کہ الیکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ وہ الیکشن کو

اگا ہوا ہے کبھی دھوپ نہیں آئی تھی۔ایک وقت میں ہم سات کارکن اس حوالات میں تھے۔ میں اور قاضی ذکاء دروازے کے سامنے بیٹھتے اور وہیں سوتے تھے۔ دو مولوی وہاں حوالات کے سامنے آتے اور جب picketing کرتے۔ تو میں اور قاضی اونچی آواز میں گانا گاتے۔ قاضی صاحب بہت اچھا گاتے تھے۔ وہ کشمیری مہاجر تھے اور سیالکوٹ میں آباد تھے۔ مولوی صاحبان شرمندہ ہوکر چلے جاتے۔ ایک پٹھان لڑکا عمر24-25 سال نام رنگو(اورنگ زیب سے بگڑا ہوا) بھی حوالات میں لایا گیا جو نمازیں پڑھتا تھا۔

دیسی شراب کو مری Murree Brewry کے لیبل لگا کر (بوتلیں کباڑ خانہ سے لیتا) بیچتا ۔صبح تھانیدار آیا اور اس کو کہا کہ فکر مت کرے ضمانت ہوجائے گی۔ دو پٹھان نوجوان کالج کے طالب علم بھی حوالات میں آئے جو ضیاء الحق کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بھٹو صاحب کا باڈی گارڈ ان کا دوست تھا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ انہیں اسلحہ دے وہ ضیاء کو ماریں گے۔ باڈی گارڈ نے پولیس کو اطلاع کردی۔ تیس دن ہمیں حوالات میں رکھا گیا۔ پھر Summery Trial شروع ہوا۔ ایک سینما کا چوکیدار گواہ تھا۔ جو شناخت پریڈ میں بھی ہمیں نہ پہچان سکا اور جب چوہدری سعید صاحب سینئر ایڈووکیٹ نے cross examination کیا تو self contradictory ہوگیا۔ ایک اوکاڑہ کا ہمارا کارکن تھتھا بھی گواہ بنایا گیا تھا۔ اس نے یہ گواہی دینی تھی کہ اسے ہم نے (چوہدری سعید مجھیانہ صاحب اور میں Sub division اور شہر کے صدر نے) گرفتاری دینے کے لیے بھیجا ہے۔ وہ بھی ہاتھ جوڑ کر Presiding office (ایک میجر) سے کہنے لگا کر اس نے گواہی ڈال دی ہے۔ اب اسے چھوڑ دیں۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ میجر نے کہا کہ case تو بنتا نہیں۔ کاغذات

لے کر Brigadier (سنا ہے فرحت نام تھا اس کا) کے پاس گیا۔ واپس آیا تو ہمیں ایک سال قید بامشقت اور 15 کوڑے کی سزا سنائی گئی۔ ہمیں Medical Checkup کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ہماری عمر کے حساب سے کوڑے نہیں لگ سکتے تھے۔ پولیس کی جالی والی قیدیوں کی لاری کے ذریعے ہمیں جہلم جیل منتقل کردیا گیا۔ جالی والی لاری میں بیٹھ کر بازار میں سے گزرے تو شہر کی دوکانیں اور رونق بہت سہانی لگی۔ جہلم پہنچتے ہی گوجرانوالے کے کارکن کو کوڑے لگا دیئے گئے۔ اور ہسپتال لے گئے۔ جہلم جیل میں تقریباً 10 کارکن اوکاڑہ سے تھے جنہیں کوڑے لگ چکے تھے۔ وہ اپنے زخم دکھا رہے تھے۔ اور واقعات سنانے لگے۔ کہ انہیں کہا گیا تھا کہ گرفتاری دینے کے بعد بھٹو صاحب چھوٹ جائیں گے۔ اور تم چاہے کوئی agency لے لینا یا کوئی نوکری۔ تم کو یہ بتانا ہے کہ ہمیں اظہر اور چوہدری سعید نے بھیجا ہے۔ قاضی صاحب نے بھی سیالکوٹ کے لڑکے سے باتیں پوچھیں۔ وہ تو کارکن ہی نہیں تھا۔ اسے کسی جماعت اسلامی والے نے بھیجا تھا کہ وہ گرفتاری دے۔ وہاں مختلف جگہوں کے کارکن جمع ہوگئے۔ جن کی کہانیوں سے یہ واضح ہوگیا کہ یہ راجہ انور والی گرفتاریاں اور کوڑے وغیرہ محض ایک ڈرامہ ہے۔ جس کا مقصد کارکنوں کو منتشر کرنا اور ہراساں کرنا ہے۔ تاکہ کارکنوں کی طاقت ختم ہوجائے۔ گرفتاریاں صرف اوکاڑہ۔ گوجرانوالہ۔ سیالکوٹ سے ہی کی گئیں۔ لائیلپور سے صرف چند آدمیوں نے گرفتاری دی۔ مختار رانا کے بعد لائیلپور میں کارکنوں کی تنظیم اور طاقت پھیکی پڑ چکی تھی۔ باقی اضلاع سے کوئی گرفتار نہ ہوا۔ صرف گوجرانوالہ اور اوکاڑہ میں کارکن طاقت رکھتے تھے۔ جہلم جیل سے میں نے اوکاڑہ سے آنے والے کارکنوں کو سمجھایا کہ گرفتاریاں وغیرہ بند کریں یہ تو

سرکاری ڈرامہ ہے۔

جہلم جیل میں ہماری مشقت کرسیاں بننا تھا۔ایک گیارہویں جماعت کا طالبعلم بہاولنگر سے گرفتار ہوکر جہلم جیل میں آیا تھا۔اسکی مشقت منج کوٹنا تھی۔اس لڑکے کی عمر چھوٹی تھی مگر شکل وصورت سے ایک بڑی عمر والا آدمی نظر آتا تھا۔چوہدری سعید صاحب نے کہا کہ یہ مشقت تو اس بچے کے لیے بہت ہی بھاری ہے۔سب لوگ باری باری اس کا ہاتھ بٹائیں۔تو ہم سب لکڑی کے مونگلے سے باری باری اسکی مونج کوٹتے تھے۔دو کارکنوں نے بہت بہادری سے کوڑے کھائے ایک یاعلی کے نعرے لگاتا رہا دوسرا جیوے بھٹو کے جس کی وجہ سے اسے 15 کے بعد مزید کوڑے لگائے گئے۔جیل میں ہم سب جذبہ سے سرشار تھے۔ایک گوجرانوالہ کے کارکن کو جہلم کے بدمعاش قیدی نے مارا۔ہم اس کو مارنے والے تھے کہ سپرنٹنڈنٹ تک خبر پہنچ گئی۔سپرنٹنڈنٹ نے اسے سخت سزا دی راولپنڈی جہاں گرفتاریاں پیش کی جاتی تھیں۔ وہاں ایک پان سگریٹ کا کھوکھا تھا۔ جس کا مالک روفا تھا۔ روفا اور اس کے دوست بھولا کو بہت شرم آئی کہ لوگ دور دور سے آکر گرفتاریاں پیش کررہے ہیں۔کیا راولپنڈی بزدلوں کا شہر ہے۔اس شرم ساری سے بچنے کیلئے اُن دونوں دوستوں نے گرفتاری دے دی اور جہلم جیل پہنچ گئے۔ روفا TB کا مریض تھا ہسپتال داخل ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹیکہ لگایا تو reaction ہوگیا۔ روفا نے ڈاکٹر کا بازو پکڑ لیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب ٹھہر جائیں بہت سرور آرہا ہے۔ دراصل یہ دونوں جیالے چرس کے عادی تھے۔ پھر انہیں نشہ نہ ملا تو یہ پنڈی پارٹی کا پیپلز گارڈ جو جیل میں تھا، کو بلیک میل کرنے لگے۔ وہ کہنے لگے کہ نصرت بھٹو صاحبہ قیدیوں کے لیے جو پیسے بھیجتی ہیں یہ اکیلا ہی ہضم کرگیا ہے۔ اس بیچارے

نے انکو باہر سے چرس منگوا کر دی تو ان کا منہ بند ہوا۔

بھٹو صاحب کے personal dentist مشہور ڈاکٹر نیازی کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اور وہ بھی جہلم میں آ گئے بہت خاموش طبع انسان تھے۔

ہماری Barrack میں ایک دلچسپ بوڑھا تھا جو ہمیں نماز کی تلقین کیا کرتا تھا اور ہماری شکایتیں لگاتا تھا۔ وہ 60 سال کا تھا اور سفید لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ کلیم کے کام میں 6 کروڑ کے لگ بھگ فراڈ میں 4 سال کی سزا بھگت رہا ہے۔ فجر کی نماز کی امامت قاضی ذکاء نے کی۔ نماز کے بعد دعا شروع ہوئی۔ ''اے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو شکل موموناں اور کرتوت کافراں ہیں، ان کو برباد کردے۔ جو فراڈیے ہیں انہیں نیست و نابود فرمادے۔ ورنہ یہ قیامت تک تیرے معصوم لوگوں کو لوٹتے رہیں گے۔ مہربانی فرما کر ان سے ہمارا چھٹکارا دِلا دے۔ اے باری تعالیٰ۔ دعا ایک گھنٹہ کی تھی۔ اشارہ ضیاء کی طرف بھی تھا۔ یہ بابا ہم سے بہت بور ہوا اور کسی طرح اس نے Barrack سے بدلی کروالی۔ وہ ہمیں دیکھ کر راستہ بدل لیتا تھا۔

تقریباً 5 ماہ ہم C کلاس میں رہے۔ پھر ہماری بدلی جہلم جیل سے ساہیوال جیل ہوگئی۔ قیدیوں والی لاری میں جہلم سے ساہیوال پہنچے۔ لاہور پہنچنے پر ایسے لگنے لگا۔ جیسے اپنے گھر آ گئے ہیں۔ پھر لاہور سے اوکاڑہ تک سارا راستہ مانوس معلوم ہوتا تھا۔ اس سے پہلے ان جگہوں کو کبھی پیار کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اوکاڑہ سے لاری گزر رہی تھی تو بہت خوشی محسوس ہورہی تھی۔ چند واقف لوگ بھی نظر آئے۔ ساہیوال جیل آ گئے تو ہمیں B کلاس مل گئی۔ مجھے سکول میں جگہ ملی جہاں بھٹو صاحب بھی رہے تھے۔ دوسرے ساتھی گورا وارڈ میں تھے۔ میں بھی وہیں شفٹ ہوگیا۔ مشقت ختم ہوگئی۔ کتابیں پڑھنے کا وقت مل

گیا۔ جیل کا ٹائم ختم ہوگیا۔ گھر پہنچے۔ ہر چیز عجیب لگ رہی تھی۔ جیسے مہمان آئے ہوں۔ گھر والوں کے چہرے بھی تھوڑے دھندلے ہو گئے تھے۔

اب پیپلز پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ کارکن گرفتاری سے بچیں۔ پولیس اچانک چھاپے مارتی تھی جو بھی پکڑا جائے۔ وہ تو اتفاق کی بات تھی۔ ورنہ گرفتاری نہ دی جائے۔ مجھے ایک کارکن نے بتایا کہ گرفتاریاں ہونے والی ہیں۔ جاوید نائی شیخ بستی والا سپاہی جو CID اور Trafic پولیس میں رہا تھا۔ ہماری شناخت کراتا تھا۔ وہ مجھے راستے میں سائیکل پر ملا۔ اس نے کہا کہ میں کہاں جارہا ہوں تو مجھے اشارہ مل گیا۔ پیچھے پولیس کی جیپ بھی آنے والی تھی۔ میں تنگ گلیوں سے ہوکر لاری اڈے پہنچا اور لاہور کی چلتی لاری میں بیٹھ گیا۔ پولیس کی جیپ ریلوے پھاٹک بند ہونے کی وجہ سے رُکی رہی۔ میں اختر آباد اتر گیا۔ اگلے دن 24 چک میں چاچا فضل سے ملا۔

میں نے گھر سے کپڑے اور پیسے منگوائے اور ڈجکوٹ چلا گیا۔ وہاں رانا الطاف خاں کے گاؤں ڈیڑھ ماہ روپوش رہا۔ پھر پتہ چلا کہ عسکری حسن کی والدہ فوت ہوگئی ہیں۔ ساہیوال پہنچا۔ عسکری حسن کو جیل سے جنازہ کے لیے رہا کردیا گیا۔ 3 دن وہاں رہ کر اوکاڑہ گاؤں میں آگیا۔ سوچا کہ گرفتاری ہو تو پرواہ نہیں مگر مفرور رہنا بہت مشکل کام ہے۔ ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے۔

ساہیوال میری Mother in Law نے مجھے cheque دے کر بنک سے پیسے لانے کے لیے بھیجا۔ بنک کے منیجر چوہدری سعید مجھیانہ کے عزیز تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بھٹو صاحب کو صبح پھانسی دے دی گئی ہے۔ BBC کی خبر ہے۔ سن کر ٹانگیں جھوٹی پڑ گئیں۔ مگر خود کو کنٹرول کرکے پیسے لے کر پہنچا۔ بیوی کو بتایا پھر سب کو ساتھ لے کر اوکاڑہ گاؤں پہنچے۔ بیوی بچوں

کو گھر چھوڑا۔ اسی تانگے سے واپس اوکاڑہ پہنچا تو چونگی نمبر 7 پر کوئی پچاس کے قریب لوگ جمع تھے۔ سب مولوی صاحب (موچی محلّہ) کے انتظار میں تھے کہ جنازہ پڑھائیں مگر انہیں پولیس نے روک لیا۔ مولوی صاحب نہ پہنچ سکے۔ تو میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کوئی جنازہ پڑھانا جانتا ہے تو ہمارے محلے کے طالب علم شمسی نے جنازہ پڑھایا۔ کارکنوں سے کہا کہ صبح بڑے قبرستان میں بھی جنازہ ہوگا۔ شہر میں اور کارکنوں سے بھی رابطے کیے گئے۔ صبح کارکن قبرستان میں جمع ہوگئے۔ کچھ لوگوں کو اطلاع نہیں ہوئی تھی تو انکو گھروں سے لے کر آئے۔ غائبانہ جنازہ پڑھا۔ واپسی پر AC صاحب نے کہا کہ کارکن دکانوں پر توڑ پھوڑ کررہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ میری duty نہیں۔ آپ کے کارکن ہیں۔ انہوں نے کہا۔ میں نے جوابدیا ان پر بھی گولی چلادیں۔

آگے آئے تو ایک Ginning فیکٹری المشہور نوابوں کا کارخانہ کے رہائشی مزدوروں نے کہا کہ ان کی مسجد میں بھی جنازہ کروانا ہے۔ ہم لوگ جلوس کی شکل میں جارہے تھے۔ تو سکندر اقبال (بے نظیر کے منہ بولے بھائی) اپنی کوٹھی سے کار میں نکلے اور جلوس کے پاس سے آنکھ بچا کر نکل گئے۔ کارکنوں نے شور کیا کہ دیپالپور چھپنے جارہا ہے۔ فیکٹری میں جنازہ کے بعد اعلان کیا گیا کہ کل بڑے قبرستان میں پھر غائبانہ جنازہ ہوگا۔ اگلے دن صبح مجھے گاؤںL-52/2 سے گرفتار کرلیا گیا۔ preventive detention بھٹو صاحب کی شہادت کے بعد تین ماہ کی تھی۔ جس کے تحت ساہیوال پولیس چوکی نزد میونسپل کمیٹی کے ساتھ والی حوالات میں رکھا گیا تھا کہ راؤ عبدالستار وہاں ملنے آئے اور رائے میاں خاں کی موت کی افسوس ناک خبر سنائی۔ بعد میں مجھے تین ماہ کے لیے ساہیوال جیل منتقل کردیا گیا۔

جیل سے آئے تو زندگی بے مقصد اور بے کیف ہوگئی۔ بھٹو صاحب کی پھانسی سے اداسی ہر وقت ماحول میں تیرتی رہتی۔ جمہوریت قائم بھی نہیں ہوئی تھی کہ قتل کر دی گئی۔ اور قاتل اسلام کے نام پر دراز تھا۔ اتنی مایوسی ہوگئی تھی کہ سمجھ نہیں آتی تھی۔ کہ ہماری زندگی میں کبھی یہ اندھیری رات ختم بھی ہوگی؟ اسلام فروش مولوی، فوجی ڈکٹیٹر شپ کی حمایت کر کے اسلام کو عوام دشمن مذہب ثابت کر رہا تھا۔

دم گھٹنے لگا تو سیاسی جماعتیں اکٹھی ہونے لگی۔ اور ایک movement for restoration of democracy بنائی گئی(MRD)۔ جس کے سیکرٹری جنرل پھر راؤ رشید سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو بنے پھر پیپلز پارٹی میں بعد میں غنویٰ کے ساتھ گروپ بنا۔ پھر ٹکا خان کو پیپلز پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ نچلی سطح کے کارکن کو کیسے سمجھ آئے۔ کہ وہ کس Democracy کے لیے سرگرم ہے؟ ساری disallusion جیل میں ہوئی۔ جیل میں زندگی کو دوسرے زاویے سے دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ جو انصاف غریب آدمی کو ملتا ہے اس کی کچھ سمجھ جیل میں آتی ہے۔Trial زندہ حالت میں سامنے Kafka's Trial ہوتا ہے۔

محمد علی نمبردار، سرور اور میں لاہور روٹی پلانٹ گئے وہاں جلسہ تھا جسے چوہدری گلزار اور مرزا ابراہیم صاحب نے address کرنا تھا۔ ہائی کورٹ کے راستے میں شیخ رفیق اتفاقاً مل گئے۔ فرمایا کہ اوکاڑہ میں MRD کی Organisation ابھی تک نہیں بنائی گئی کیا وجہ ہے؟ بناؤ تو سہی۔ میں نے چوہدری سعید صاحب کو شیخ رفیق کا حکم سنایا تو چوہدری صاحب نے فرمایا کہ بنا لیتے ہیں۔ پارٹیوں کی میٹنگ بلا کر تنظیم بنالی۔ مجھے سیکرٹری اور جمعیت علما

اسلام کے مولانا گیلانی کو صدر بنایا گیا (صدارت rotation سے تھی) MRD
کے جنرل سیکرٹری راؤ رشید ریٹائرڈ ڈائریکٹر انٹیلی جنس بنائے گئے تھے۔ خفیہ
ہاتھ نے بنوایا ہوگا۔

بھٹو family ملک سے باہر تھی۔ MRD غیر محسوس tempo سے
چل رہی تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن ضیاء کو اسلام کا نمائندہ ماننے سے انکاری تھے۔
جونیجو صاحب کو Prime Minister بنایا ہوا تھا۔ روس افغانستان سے واپس
جانا چاہتا تھا۔ ضیاء الحق کی منشاء کے برعکس جونیجو صاحب نے روسی فوجوں کی
واپسی کے معاہدے پر دستخط کردیئے۔ انہیں وزارتِ عظمیٰ سے فارغ کردیا گیا۔
ضیاء الحق شاید ضمیر کی آواز سے (کچھ کہہ نہیں سکتے) یا ہوسکتا ہے خوف کی وجہ
ہو۔ بہت گھبرایا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ ضیاء
نے کہا کہ اسے چاروں طرف آگ ہی آگ نظر آرہی ہے۔ پھر اچانک ہوائی
جہاز کا Crash ہوا، جس میں ضیاء اور دوسرے فوجی افسران سوار تھے۔ یک دم
پاکستان کی فضا تبدیل ہوگئی غریب لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ضیاء الحق کو
اسلام آباد کی فیصل مسجد کے کونے میں دفن کیا گیا۔ تاکہ اسے شہید اور اسلام کا
بڑا مجاہد ثابت کیا جائے۔ ضیاء شہید Foundation بنائی گئی۔ 2-3 سال قبر پر
برسی منائی گئی، جس میں زیادہ تر تاجر مولوی اور اس کی برادری کے لوگ شامل
ہوتے تھے۔ اوکاڑہ میں ضیاء شہید لائبریری بنائی گئی پیپلز پارٹی والے بہت خوش
تھے کہ ان کی حکومت آنے والی ہے۔ ان کے رستے کا روڑہ صاف ہوگیا ہے
کچھ کارکن یہ بھی کہتے تھے کہ بھٹو کا بدلہ پورا ہوگیا ہے۔

جب بھٹو صاحب کے meteoric - Career کی طرف سوچ
دوڑی تو بہت دکھ ہوا۔ غریب طبقے ان سے بہت توقع رکھتے تھے۔ مگر وہ ان

کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ Social Democracy بنانے کے لیے سیاسی پارٹی بنائی۔ مگر خاتمہ ملاؤں کے ہاتھوں میں کھیلنے پر ہوا۔ مرزائیوں کو قانون کی مدد سے non muslim قرار دے کر secularism کے اصول کی نفی کر ڈالی۔ اسی طرح بلوچوں اور پٹھانوں کو Crush کر کے Centre کو strong کیا اور ایک Federal security force بنائی۔ بلوچستان پر بمباری اور ولی خان کو جیل میں ڈال کر اکیلے رومالی لے گئے۔ اس طرح federation کا اصول بھی بالائے طاق ہوگیا۔ پارٹی میں چناؤ (election) یا تنقید (critisism) کو برداشت نہ کیا گیا۔ بڑے عہدوں پر مرضی کی نامزدگیاں (nominations) کی گئیں۔ نیچے سے اوپر کبھی کوئی proposal یا suggestion وغیرہ نہ پہنچ سکتی تھی۔ حکومت صرف فوج اور بھٹو صاحب کی اقتدار کی بندر بانٹ (power sharing) رہ گئی تھی۔ اس صورت حال کو جمہوریت کی کونسی صورت (form) کہا جانا چاہیے۔ ملوانا گردی (Mullaism) کے مضبوط ہونے سے مرزائی دوسرے ملکوں کو بھاگنے لگے۔ مگر پاکستان میں مذہبی فرقہ پرستی کے جنون کی وجہ سے مساجد اور امام بارگاہوں پر حملے شروع ہوگئے۔ Mullaism کے مضبوط ہونے سے جاگیرداری (feudalism) بھی مضبوط ہوئی۔ کیونکہ مولوی اس کے لیے مذہبی جواز پیدا کرتے تھے۔ یہ بھٹو صاحب کا شاید اندر کا Self تھا۔

واپڈا ہاؤس کے سامنے Free Mason's Hall میں ملٹری آفیسرز کا بورڈ بیٹھا۔ جس نے قومی اور صوبائی ممبران کے حساب کتاب کے علاوہ زمین جائیداد اور مراعات جو حاصل کی گئیں تھیں کی Checking کی۔ حساب کتاب میں سو فی صد سرخرو ہوئے۔ نہ کوئی لائسنس لیے، نہ بیچے، نہ پرمٹ، نہ

مراعات، الاٹمنٹس، رشتے داروں کو ملازمت وغیرہ کچھ نہ برآمد ہوا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد DC اوکاڑہ نے notice بھیجا کہ فلاں تاریخ کو میں Chief Secretary سے لاہور میں ملوں۔ Notice لے کر آنے والوں میں ایک پٹواری اور جاوید نائی پولیس کانسٹیبل رہائشی شیخ بستی اوکاڑہ تھے۔ جاوید پولیس کانسٹیبل مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ گرفتاری کے وقت وہی میری شناخت (identification) کیا کرتا تھا۔ وہ CID اور Traffic Police میں رہا تھا۔ جاوید کا سارا گھرانہ پیپلز پارٹی میں تھا۔

میں نے پوچھا کہ کس لیے ملوں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو اہلکار ہیں۔ انہیں نہیں پتہ۔ میں نے کہا کہ ایسے تو میں نہیں جاؤں گا۔ (سب کو پتہ تھا کہ مجلس شوریٰ بن رہی ہے) میرا انکار سن کر وہ واپس چلے گئے۔ اگلے دن آئے تو انہوں نے کہا کہ دستخط کر دیں کہ آپ کو نوٹس serve ہوگیا ہے۔ میں نے تعمیل کر دی۔

اس کے بعد راؤ افضل کو مجلس شوریٰ میں لیا گیا۔ راؤ افضل سے پہلے مجھے ممبر مجلس شوریٰ بننے کے لیے کہا گیا تھا۔ میں تو شامل نہیں ہوسکتا تھا (میرے نظریات)۔

اب بے نظیر صاحبہ کے لیے میدان صاف تھا۔ وہ امریکہ تشریف لے کر گئیں تاکہ دنیا کی واحد سپر پاور کو یقین دہانی کرواسکیں کہ وہ سپر پاور کے مفادات کو appreciate کرتی ہیں۔ ان کے والد کے زمانے کی غلط فہمیاں ختم ہونی چاہییں۔ جس دن محترمہ صاحبہ امریکہ تشریف لے گئیں میں نے اور چند دوستوں نے پارٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ استعفیٰ ہم لوگوں نے اس سوچ اور feeling کی بنا پر دیا۔ کہ بے نظیر صاحبہ تو وزیراعظم کی کرسی پر آنے والی ہیں اور اب باپ کے قاتلوں کے ساتھ Power Sharing

کریں گی۔ جمہوریت کے لیے لوگوں کی قربانیاں تو ضائع ہو ہی گئیں۔ ہم کیوں اس گناہ میں شریک ہوں؟

بے نظیر کو بھٹو صاحب کی شہادت کی ہمدردی کا ووٹ ملا۔ اس کے علاوہ بھٹودور میں جو معاشرتی تقسیم (polarization) ہوئی (Bhutto Vs Anti Bhutto) اس میں غریب طبقے کی تعداد PPP کے لیے نعمت تھی۔ بے نظیر وزیر اعظم بن گئیں۔ انہوں نے وہی style اپنایا جو ورثے میں ملا تھا۔ مگر چند تبدیلیاں بھی ہوئیں۔

راؤ افضل ممبر مجلس شوریٰ کو بعد میں بے نظیر سے ٹکٹ بھی مل گیا۔ بھٹو کے دشمنوں کو بھی ٹکٹ مل گئے۔ کچھ لوگوں کو directly promote کیا گیا۔ مگر بعد میں وہ سب پرویز مشرف کے ساتھ چلے گئے۔ بے نظیر نے شاید سیاسی کلب بنائی تھی۔ ان کے دماغ میں سیاسی جماعت کا تصور نہیں تھا۔ دو دفعہ وزیر اعظم رہیں مگر عوام کے لیے کچھ نہ کیا۔ صرف ego کی kick کو enjoy کرتی تھیں۔

ہم لوگوں نے جو سمجھا تھا۔ وہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ ہمارا استعفےٰ justified ہوا۔ ہمارے بعد اور لوگوں نے بھی چھوڑنا شروع کر دیا۔ اب بھٹو دور کے چیدہ لوگ ہی بچے ہیں۔

میری وکالت تو چلنا ہی نہ شروع ہوئی تھی۔ امین فاروقی کی اچھی خاصی چلی چلائی وکالت بھی فیل ہونا شروع ہوگئی۔ انہیں اور چوہدری سعید صاحب کو پارٹی کے کارکنوں کی مفت بیکار (fatigue) برداشت کرنی پڑتی۔ بہرحال حوصلے سے چلتے رہے۔

امین فاروقی صاحب کی صحت اچھی نہیں تھی۔ piles کی وجہ سے کمزوری تھی اس لیے party کی سرگرمی سے دور ہی رہتے تھے۔ ورنہ پارٹی

کے جیالے تو 24 گھنٹے کام کرنے سے بھی نہیں بھگتائے جا سکتے تھے۔ رات کو 12-11 بجے ہوٹل سے گاؤں کی طرف روانا ہوتا۔ راستے میں دیپالپور چوک ایک اہم پڑاؤ تھا۔ وہاں ہمارے بزرگ دوست سید منیر شاہ کا گھر تھا سارے دن کی کارکردگی اور اگلے دن کے پروگرام بھی ان کے مشورے سے بنتے۔ شاہ صاحب عمر میں تو بہت بڑے تھے۔ مگر ہر عمر کے انسان سے گھل مل سکتے تھے۔ وہ پرانے خاکسار تھے۔ ہمیں مشکلات میں گھبرانے نہیں دیتے تھے۔ پھر وہاں سے 2 بجے رات یا تھوڑا آگے پیچھے گاؤں کو چل پڑتا۔ سائیکل پنکچر ہو تو سائیکل ہاتھ میں پکڑ کر پیدل جانا پڑتا تھا۔ سڑک کچی تھی۔ بارش میں پرابلم بنتی تھی مگر والدہ کے پاس ضرور پہنچنا ہوتا تھا۔ تقریباً سات سال یہی routine رہی۔ صبح کا ناشتہ بہت heavy کرتا کیوں کہ 24 گھنٹے کے لیے ہوتا۔ دن میں صرف چائے پیتا کیوں کہ ہوٹل کا کھانا مہنگا پڑتا تھا۔ جس کے لیے جیب اجازت نہ دیتی تھی۔ بعض دفعہ راستے میں کالے (چور، ڈاکو) بھی ملتے مگر کسی کو نہ اطلاع ہونے دیتا۔ کیوں کہ والدہ صاحبہ تو میرا جانا آنا ہی بند کروادیتیں۔ شریک لوگ شکایتیں کرتے۔ میری والدہ صاحبہ ان پر اعتبار نہ کرتیں۔ گرمی، سردی، بارش سب کچھ برداشت کرنے کی وجہ سے زندگی میں کافی سخت جان ہوگیا تھا۔

کچھ کارکن دوست valium کے addict بن گئے تھے۔ جن میں سعید منٹو، احسان الحق، بھوپا، بوٹا نائی، چوہدری بوٹا آڑھتی غلہ منڈی، ظہور لودھی حالانکہ یہ انکی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہی انکی early موت کا باعث بھی بنی۔ علی احمد مجاہد ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری ضلع اوکاڑہ (سکندر اقبال کا دور) اور اعجاز اطہر ایڈووکیٹ جنرل سیکرٹری ساہیوال دونوں heroin کے addict بن گئے۔ علی احمد اندھا ہو کر فوت ہوگیا۔ اور اعجاز اطہر بھی نیم پاگل ہوگیا۔ اُس کے

اس فعل نے نیک سیرت بیوی کو بہت اذیت پہنچائی۔

مسٹر تصوّیر حسین heroin فروخت کرتا تھا۔ اور شاید پیتا بھی ہو۔ وہ بھی مر گیا۔ ان تینوں کا گروپ تھا۔

محترمہ کو جو style اور form سیاسی ورثہ میں ملی ہے آخر وہی repeat ہوئی اور ادارہ سازی (insititionalise) ہوگئی۔ کفارہ دینے کے قابل نہیں۔ احساسِ جرم ہے۔ کہ unconciously ہم بھی استعمال ہونے والوں میں سے تھے۔

ہم ان جذبات کے ساتھ ANP میں شامل ہوگئے کہ (پنجاب میں انہیں پاکستان دشمن سمجھا جاتا ہے) اور اس پارٹی کے کارکنوں کی تعداد تھوڑی ہے۔ وہ مذہبی رواداری (secularism) اور وفاقیت (Federalism) میں یقین رکھتے اور اس پر عمل پیرا ہیں۔ حقیقت میں پاکستان کے سیاسی، سماجی مسئلے کا حل بھی اس میں ہے۔ بانی پاکستان بھی federalism اور secularism میں یقین رکھتے تھے مگر ترقی معکوس (retrogressive evolution) کے باعث ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ اس کے لیے کون سے عوامل اور شخصیات ذمہ دار ہیں۔ تاریخ دان واضع کرے گا۔ راقم تو ایک کارکن کے ذاتی محسوسات بیان کر رہا ہے۔

بے نظیر صاحبہ پاکستان تشریف لائیں تو لاکھوں لوگ استقبال کر رہے تھے۔ اوکاڑہ تشریف لائیں تو میرے گھر کے سامنے (صدر پورہ روڈ) سے جلوس نے گزرنا تھا۔ میں نے اپنے گھر پر سیاہ جھنڈا نصب کر دیا۔ جسے پولیس نے اتار دیا۔

ANP اوکاڑہ کے پہلے ضلعی صدر ماسٹر جلال صاحب جن کا تعلق دیپالپور شہر سے ہے منتخب ہوئے۔ پنجاب کے صدر راؤ مہروز اختر تھے۔

ہم باقاعدگی سے پانچ ، سات کارکن ANP کی صوبائی میٹنگ جو لاہور میں ہوتی تھی۔ میں شرکت کے لیے جاتے۔ ان میں ماسٹر جلال ،ملک سرور، خان، سلطان خان ،شوکت قریشی ایڈووکیٹ ، بائی بشیر، مشتاق بھٹی اور میں ، ہمارے علاوہ اس میٹنگ میں لاہور کے کچھ دانشور ، وکلاء اور اخبار نویس بھی شرکت کرتے تھے اس دوران پروفیسر عزیز الدین احمد اور امتیاز عالم کی رہنمائی بھی شامل رہی۔

ہم پشاور پارٹی کنونشن میں گئے۔ اس پہلی کنونشن میں سردار شوکت صاحب ANP پنجاب کے جنرل سیکرٹری بھی شریک ہوئے۔ انکی زمین قصور کے علاقہ میں تھی۔ وہVIA اوکاڑہ جایا کرتے تھے۔اوکاڑہ میں وہ پارٹی کا کام بھی Check کرلیتے تھے۔ اب وہ پارٹی کے مرکزی جنرل سیکرٹری بننا چاہتے تھے۔ ان کے مقابلے میں سندھ سے پلیجو صاحب تھے۔ اوکاڑہ والوں نے پلیجو کو سپورٹ کیا۔ سردار صاحب ناراض ہوگئے ہمارا نظریہ تھا کہ عہدے دار دبائی گئی قومیتوں کو (Oppressed nationalities) سے لیا جائے۔ پنجاب کوتو پہلے ہی استحصالی صوبہ (exploiter province) سمجھا جاتا ہے۔ پلیجو صاحب بعد میں ANP کو چھوڑ گئے اور اپنی الگ پارٹی بنالی۔

PPP سے میں نے بے نظیر کے امریکہ جانے پر resign کیا تھا۔ ہمارے گرو کامریڈ عبدالسلام صاحب چوہدری عبدالرزاق کی ٹکٹ (الیکشن 1970ء) کے مسئلے پر مجھ سے کھچے رہنے لگے تھے۔ جب ہم لوگ PPP کو چھوڑ کر ANP میں شامل ہوگئے تو کامریڈ صاحب ہمیں پسند نہیں فرماتے تھے۔ ان کا کام کرنے کا طریقہ اور ان کی شخصیت مختلف تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ہماری ایک چال ہے PPP والے ANP اور ستلج کاٹن ملز کی ٹریڈ یونین پر قبضہ

کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ اندر سے اب تک PPP والے ہی ہیں۔ یہ لوگ اوکاڑہ کی سیاست پر اجارہ داری چاہتے ہیں۔ پنجاب کی ANP پارٹی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی، جس کے سربراہ محترم حبیب جالب صاحب تھے۔ وہ اس سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے اوکاڑہ تشریف لائے ان کے ساتھ راؤ مہروز صاحب بھی آئے، مجھ سے نظریاتی اور ذاتی سوالات بھی پوچھے گئے۔ میں نے 1955-56 یونیورسٹی لاء کالج کے زمانے کے groups میجر اسحاق، ظفر اللہ پوشنی، سیف خالد ،رانا سخاوت ، عابد منٹو اور کافی ہاؤس کی sittings کے واقعات سنائے ۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔ کہ یہ (اظہر) ہم میں سے ہے۔ ہمارے بعد کے عمل نے بھی یہی ثابت کیا۔ ہم چاہتے تھے کہ کامریڈ ایک senior سیاسی کارکن ہیں۔ مختلف ادوار میں سے گزرے ہیں۔ ہندوستان اور روس بھی دیکھا ہے۔ دور رس نظر ہے۔اِن سے سیکھیں گے۔ کام کریں گے۔ اب اس اندھیر نگری میں مزدور طبقہ کو ظلم کی چکی میں پیسا جارہا ہے۔امرتا پریتم کا شعر یاد میں ابھرتا ہے۔"کتے قبراں وچوں بول"

ANP کے پشاور میں ہونے والے کنونشن میں ولی خاں سب شامل ہونے والوں کو اٹھ کر ملتے تھے،بغل گیر ہوتے اورحال چال پوچھتے تھے۔ پشاور کے امین ہوٹل میں رہائش پارٹی free دیتی تھی۔ جب ولی خاں سرور سے بغلگیر ہوئے اور ماتھا چوما تو وہ بہت جذباتی ہوکر رونے لگا۔ بعد میں بتایا کہ ہم جیسے لوگوں کے ساتھ بغل گیر ہوکر ماتھا چومنا ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب کو تو دس گز کے فاصلے سے ہی دیکھ سکتے تھے۔

پارک میں کنونشن کا انتظام تھا۔ 12-13 سال کے بندوق لٹکائے لڑکے تلاشی لیتے۔ پولیس کو نزدیک آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے بھی شہر میں

ہر چوک میں دو دو سپاہی کھڑے رہتے تھے کسی بات میں دخل (پنجاب کے برعکس) نہیں دیتے تھے۔ ہم کارکنوں کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔

اس کے بعد اوکاڑہ میں اجمل خٹک کا اپنے گھر جلسہ کروایا۔ جس کی صدارت بائی بشیر نے کی۔ 200 سے زیادہ دانشوروں اور کارکنوں نے شمولیت کی۔ اوکاڑہ کے دانشوروں کے رویے سے۔ خوش ہوئے۔ عوام کو سرکاری propaganda نے prejudicial کیا ہوا تھا۔ خٹک صاحب کی زبانی منشور سنا۔

اس کے علاوہ انہوں نے کہا۔ وہ روس لال دلہن لینے گئے تھے۔ مگر اُنہوں نے کہا کہ تمہارے تو دولہا ہی نہیں ہے (سمجھتے ہو نا؟) یہ جواب لے کر میں پاکستان آ گیا۔ آج میں بھائیوں میں ہوں اور سٹیج سے دیکھ رہا ہوں دوستوں کے چہرے اور آنکھیں۔ سب سمجھتے ہیں اور تیار ہیں۔ اوکاڑہ میں دوستوں سے مل کر میں کہتا ہوں کہ ہمارا دولہا ہے۔ عبدالرزاق L-54/2 نے ANP کے جھنڈے کے رنگوں سے قمیض تیار کر کے پہن رکھی تھی اور کام کرتا پھر رہا تھا۔ خٹک صاحب نے رزاق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ایسا کارکن شہر کے لیے اکیلا ہی کافی ہے۔ کامریڈ عبدالسلام صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ دیپالپور اور حجرہ سے بھی دوست آئے تھے۔ ملک افضل وٹو صاحب فوت ہو چکے تھے۔ وٹو صاحب نے مجھ سے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ وہ ایک دفعہ اجمل خٹک سے مل آئیں تو کام شروع کرتے ہیں۔

اگلے پارٹی کنونشن میں عبدالولی خان پارٹی کی صدارت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی جگہ اجمل خٹک کو پارٹی کا صدر اور خالق خاں کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ یاد رہے کہ عوامی نیشنل پارٹی کے تمام عہدوں پر باقاعدہ الیکشن ہوتا ہے۔
تین مرکزی جوائنٹ سیکرٹریز منتخب کیے جاتے ہیں (پنجاب، بلوچستان

اور سندھ سے) مجھے پنجاب سے جوائنٹ سیکرٹری چنا گیا۔ راؤ مہروز اختر بھی پارٹی کی صوبائی صدارت سے سبکدوش ہوئے۔ انہیں پنجاب کا رہبر بنایا گیا۔ اسی طرح عبدالولی خان صاحب کو پارٹی کا رہبر اعلیٰ بنایا گیا۔ عبدالولی خاں 75 سال کے ہو گئے تھے۔ انہوں نے خود پارٹی سے درخواست کی تھی کہ ان کو آرام کی ضرورت ہے۔

ملک سرور کے بھائی محمد عالم ریلوے میں ملازم تھے۔ اور یونین کے سرگرم کارکن تھے۔ جماعت اسلامی کی یونین کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ اب ریلوے کی منسٹری غلام محمد بلور خاںANP کو ملی تو یونین نے اپنی کنونشن میں ریلوے کے منسٹر کو مہمان خصوصی بنانا چاہا۔ اس لیے سرور اور میں نے راؤ مہروز اختر سے request کی کہ ریلوے کا منسٹر مہمان بنے۔ لہذا رائے ونڈ کے سٹیشن پر ایک جلسہ کا انتظام کیا گیا جس میں پشاور راولپنڈی، کوئٹہ، کراچی، سکھر، حیدرآباد تک سے سب یونین ممبرز اور ان کے لیڈر تشریف لائے۔ ریلوے منسٹر کے علاوہ اجمل خٹک بھی شامل ہوئے۔ بہت رونق ہوئی۔ پوری رات ڈھول کی تھاپ اور آگ کے الاؤ کے ساتھ ڈانس ہوئے۔ اور جلسہ کی تیاری کی گئی۔ سٹیج وغیرہ بنایا گیا۔ منسٹر نے مطالبات سنے اور سرپرستی کا وعدہ کیا۔ راؤ مہروز اختر صاحب کو پگڑی پیش کی گئی کہ ان کی محنت سے پنجاب میں ANP مقبول ہوئی ہے۔ ڈھول اور الاؤ (سردی کی رات) کی موجودگی میں کارکن سٹیج بنانے میں مصروف تھے۔ مجھے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی سی خوشبو محسوس ہوئی۔ ڈھول پر بھنگڑا ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ پرانے وقتوں کا یہ War Dance ہے۔ اب تھوڑی شکل بدل کر کھیلوں کے میدان میں مقبول ہو گیا ہے۔ کہیں ڈھول بجے پنجابیوں کے ہاتھ تھرکنے لگتے ہیں۔

بے نظیر کی شادی ہوئی۔ تو ولیمہ زرداری ہاؤس میں دیا گیا۔ چونکہ حاکم

زرداری صاحب ANP کے ممبر تھے۔ پنجاب سے 5 لوگوں کو invite کیا گیا۔ راؤ مہروز، ماسٹر جلال صاحب اور میں بذریعہ ریل گاڑی کراچی پہنچے ہمیں ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل میں ہمیں پلیجو اور انکا لڑکیوں کا گروپ جو سندھی زبان میں ڈرامے کرتا ہے۔ ملنے آیا۔ یہ انقلابی لڑکیاں بہت confidence لیے ہوئے تھیں۔ اگلے دن ولیمے کے لیے زرداری ہاؤس پہنچے کارڈوں سے entry تھی۔ جناب ولی خان ولیمہ کے مہمان خصوصی تھے اور ہم ان کے وفد کا ہی حصہ تھے۔ بہت بڑی کوٹھی کے پلاٹوں میں بہت لوگوں کا انتظام تھا۔ مختلف طبقوں اور professions سے لوگ تھے۔ ہر پلاٹ میں چھوٹے dias بنائے گئے تھے۔ جس پر کچھ عرصہ کے لیے دولھا اور دلہن بیٹھتے تاکہ لوگ ان سے مل سکیں۔ دیکھ سکیں۔ لوگ تصویریں بنا رہے تھے میں نے بھی تصویریں بنائیں۔ مختلف اقسام کے کھانے تھے جن میں بہت سے میری اور جلال صاحب کی پہچان سے باہر تھے۔ ایک sense میں پوری کراچی دیکھی گئی۔ صرف سمندر رہ گیا جو میں نے اور جلال صاحب نے شام کو دیکھا۔ (اس سے پہلے کراچی نہیں دیکھی) اس شادی میں سندھ کا کلچر نظر نہیں آیا۔ بس Anglicised لوگ۔ بوڑھے پارسی جوڑے آہستہ آہستہ چلتے آرہے تھے۔ دولہا کی والدہ انہیں خوش آمدید کہتیں اور انگریزی میں گفتگو کرتیں۔ دولہا میاں کی والدہ جناب ذوالفقار علی بخاری کی بیٹی اور سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور احمد شاہ بخاری پطرس کی بھتیجی ہیں۔ ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ حاکم زرداری صاحب سے تو پشاور میں ملاقات ہوجاتی تھی۔ شادی کے بعد انہیں پیپلز پارٹی میں جانا پڑا۔ تیسرے دن قائداعظم کا مقبرہ دیکھ کر اوکاڑہ واپس آگئے۔

ایک ANP کا جلسہ 40 چک نزد اوکاڑہ منعقد ہوا۔ ماسٹر جلال

صاحب صدر ANP ضلع اوکاڑہ نے اس جلسہ کی منظوری دی۔ اس جلسہ کو بلور صاحب منسٹر ریلوے، خٹک صاحب اور مہروز اختر صدر ANP پنجاب نے address کیا۔ راؤ صاحب نے پر جوش لہجہ میں فرمایا کہ منفی سرکاری پروپیگنڈا کے باوجود ANP پنجاب کے دیہات تک پہنچ گئی ہے۔ truth has to prevail at last۔

عبدالولی خان کی وفات پر میں گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے جنازہ پر نہ پہنچ سکا۔ ماسٹر جلال صاحب نے جنازہ attend کیا۔ ہم دوستوں نے ANP کی تعزیتی میٹنگ (condolence meeting) بلوائی اور خاں صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کی کمی اس قدر محسوس ہوئی کہ بے سہارا سے محسوس کرنے لگے۔

طالبان کی تحریک کو بے رہ روی سے روکنے کے لیے secular front مضبوط کرنے کی ضرورت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ جدید اسلحہ اور ڈالروں سے مسلح نوجوانوں کی جذباتیت کو admonish کرنا محترم ولی خان جیسے بہادر آدمی ہی کا کام تھا۔ انہوں نے بن لادن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ کھیلیں اپنے ملک میں کھیلو غریب پٹھانوں کو کیوں استعمال کرتے ہو۔ پٹھانوں کو جو قیمت ادا کرنی پڑی اس سے ہی مولویوں کی سیاسی دوکانداری چمکی۔

خان عبدالغفار خان صاحب نے فرمایا کہ پشتون نہ کبھی ان پڑھ اور جاہل تھے اور نہ ہی اتنے غریب اور پس ماندہ تھے۔ انہیں انگریزوں نے اس جگہ پہنچایا۔ Tendulat کی عبدالغفار خان پر لکھی ہوئی Biography اس بات کی گواہ ہے۔ اب مولویوں نے انکا image ہی بگاڑ دیا ہے۔ ولی خان ایک سچے قوم پرست (nationalist) تھے۔ انہوں نے پٹھانوں کے حقوق اور

حالات (conditions) کو بہتر (improve) بنانے کے لیے پوری زند •
صرف کردی۔آپ پاکستان میں مزاحمتی سیاست Politics of
resistance) کے ہیرو تھے۔ پٹھانوں کو مہذب اداروں civilised
institutions) کی اہمیت سمجھانا انہیں کا کام تھا۔

جب روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں تو امریکہ کو پورا Asia
کمیونسٹ بلاک میں جاتا نظر آیا۔ انہوں نے communuonism کو افغانستان
میں consolidate نہ ہونے دینے کی پالیسی بنائی۔ اس کے لیے فوج
جماعت اسلامی اور دوسرے مولوی کام آئے۔ امریکہ سے بہت اسلحہ پیسہ اور
media کی coverage دی گئی۔ افغانستان underdeveloped تھا۔
روس اسے development دے کر ہی Win over کرسکتا تھا۔
developmenet کو Sabotage کیا گیا۔ تو development ممکن نہ
رہی۔ روسی فوج کو واپس جانا پڑا۔ اور اب افغانستان میں اسلحہ اور مذہبی جنونیت
جیسے رجحانات کو امریکہ نے نظام سرمایہ داری (capitalism) کو بچانے کے
لیے فروغ دلوایا۔ کمزور ریاست کی وجہ سے ڈرگ مافیا معرض وجود میں آئے
ہیں۔ امریکہ پہلے narcotics کی Smuggling کو ان مخصوص حالات کی
وجہ سے برداشت کرتا رہا تھا۔ اب وہ بہت مضبوط organisation بن چکی
تھیں۔جن کی آمدنی چھوٹے ملکوں کے بجٹ سے بھی زیادہ تھی۔ ضیاء الحق نے
کچھ نیک کام کیے جن کا فائدہ مافیا کو پہنچا۔ مثال کے طور پر قتل کے جرم میں
اسلامی دیت کو introduce کیا گیا۔ پیسہ دے کر قاتل قتل سے چھوٹ سکتا
تھا۔ اوکاڑہ کا مشہور case جس میں ایک خوددار counsler کو قتل کرکے اس
کی لاوارث بیوی کو دیت دے کر قتل سے رہائی پائی گئی تھی۔ غریب آدمی کے

مقابلے میں پیسے والے کو اس قانون سے بڑا فائدہ پہنچا۔ Rammand Davis کیس میں بھی امریکہ کو دیت سے بہت فائدہ پہنچا۔

شراب کے مقابلے میں Heroin زیادہ نقصان دہ تھی۔ شراب کی بندش سے heroin کا استعمال بہت بڑھ گیا اور ہزاروں نوجوان اس کے عادی ہو گئے۔

VCR کی بھی ضیاء الحق نے import کی اجازت دی تھی۔ اس کے فائدہ مند پہلو سے زیادہ ننگی فلموں کی بھرمار نے معاشرے میں بے حیائی پھیلائی۔ پاکستانی معاشرے کا تنزل ضیاء دور میں شروع ہوا۔ افغانستان میں اسلحہ اور پیسے کے علاوہ کسی ریاستی ڈھانچے اور قانون کے نہ ہونے کی وجہ سے شیروں نے جنم لیا۔ انہوں نے 11-9 کا کارنامہ کیا۔ تو امریکہ کانپ اٹھا۔ اسے اپنے گناہوں کی سمجھ آئی۔ امریکہ نے سرمایہ داری نظام کو بچانے کے لیے مذہبی جنونیت کو مسلح کیا تھا۔ افغانستان کے قبائلی نظام میں پرورش پانے والے دماغ کو اسلام کی militant dogmatic interpretation, جلد سمجھ میں آتی ہے۔ جس نے بڑے پیمانے پر Islamic Revival کی تحریک کو جنم دیا۔ اقبال بھی revivalist تھے مگر انہوں نے reconstruction of religious thought پر زور دیا۔ افسوس ہے کہ مسلمان ملکوں میں ڈکٹیٹرشپ ہونے کی وجہ سے Freedom of expression achieve نہ ہوسکی۔ اور نہ Reconstruction of religious thought کا ہی موقع آیا۔ جس میں Communism کی economic justice اور Early Islam کی Spirtual vision کا synthesis ہوسکتا تھا۔ یہی Fullfilment of Islam ہے۔ روائتی علماء بادشاہیت کی چھتری تلے جاگیرداری اور سرمایہ داری کی سیوا کرتے رہے۔ وہ اس کردار کا مظاہرہ نہ کر پائے جس کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ تحریک[1] بھٹک نہ جائے (جس کے زیادہ امکان ہیں) تو یہ unipolar دنیا کو multipolar balance میں تبدیل کر دے گی۔ ان کا positive role یہی بنتا ہے۔

اغوا برائے تاوان خودکش حملہ، دوائیوں میں ملاوٹ، بازار میں قیمتوں کا نہ ٹھہرنا، تعلیم کا کاروبار بننا، مسجدوں میں بم دھماکے، حج اور عمرہ کا کاروبار، کاروں کی چوری، ویزا میں Cheating، بے روزگاری، ڈبہ پیروں کا لوگوں کو لوٹنا، تھانے و تحصیل میں رشوت پر سودے بازی، محلوں میں دلالوں کا چوہدری بننا، ٹھیکیداروں کا غیر معیاری کام، مسجدوں اور رفاعی اداروں کے نام پر پیسہ کھانا۔ یہ سب کچھ ہمارے کلچر کا حصہ بن چکا ہے۔ امراء کا بیرون ملک پیسہ اور جائیدادیں ہیں مگر ان کی سیاست پاکستان میں ہے۔ اب بلوچستان کے علیحدہ ہونے کی باتیں سننے میں آنی شروع ہوچکی ہیں۔ امراء باہر آباد ہوجائیں گے۔ غریب لوگوں کے سر پر مصیبت ٹوٹنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔

یہ سیاسی ڈھانچہ جو اب رائج (evolve) ہوچکا تھا۔ عوام کے نام پر۔ عوام کو استعمال کر کے۔ عوام کو (ان کے جمہوری حقوق سے) ہمیشہ کے لیے فارغ (dispose off) کرتا ہے۔ یہ ڈھانچہ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اسلامی ممالک اور دوسرے III ورلڈ ملکوں میں رائج ہے۔

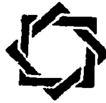
سیاسی جماعتیں بھی عوام کی جماعتیں نہیں ہیں۔ چند امراء کا شغل سیاست ہے۔ ان کے حاشیہ بردار سیاسی کارکن کہلاتے ہیں۔ ان کی کوئی say نہیں ہوتی۔ چھوٹے موٹے کاموں کی خاطر کارکن ان سے چمٹے رہتے ہیں۔ آپس میں الجھیں تو کہتے ہیں "میں نے کیا لیا ہے"؟

۱۔ تحریک سے مراد امریکہ کے خلاف افغانستان میں جاری مزاحمتی تحریک ہے۔

1985ء کے غیر جماعتی الیکشن نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ اس الیکشن کے نتیجے میں برادری ازم کو ہوا ملی۔drug mafia، قبضہ مافیا، پولیس دلال، معزز پیشے بن چکے ہیں۔ یہ لوگ elections میں حصہ لیتے ہیں۔ اگر خود نہ elect ہوسکیں تو بھی دھڑے کے اہم ممبر ہوتے ہیں۔ ان کے کام سرکارے دوارے نکلتے رہتے ہیں۔

اس نوعیت کا culture بذات خود جمہوری قوتوں کے راستے کی دیوار ہے۔ دہشت گردی کی وجہ سے ملک میں سرمایہ کاری رک چکی ہے۔ مزدور بھوک کی وجہ سے جرائم یا خودکشی کا رخ کررہے ہیں۔ کوئی Check & balance والا Setup بن نہیں رہا۔

ملک کا مستقبل کیا ہوگا۔external factor فیصلہ کن بنتا جارہا ہے۔







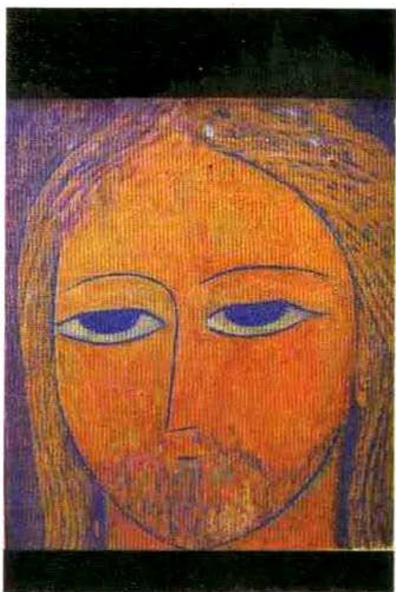


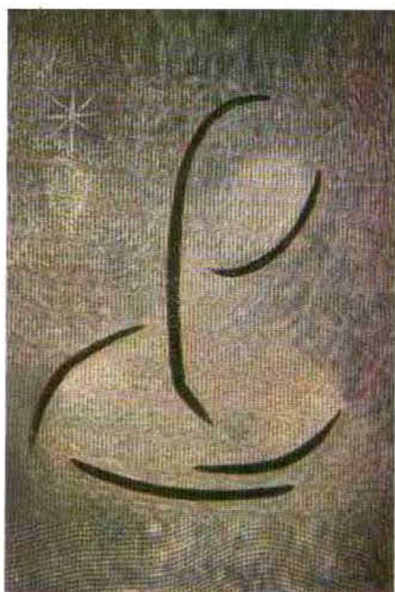


مصنف کی بنائی ہوئی پینٹنگز









مصنف کی بنائی ہوئی پینٹنگز

رانا محمد اظہر خاں 14 دسمبر 1934ء میں مشرقی پنجاب کے قصبہ ہریانہ ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم ہندو مسلم ہائی سکول ہریانہ میں حاصل کی۔ پاکستان بننے کے بعد اوکاڑہ میں آباد ہو گئے۔ ایم بی ہائی سکول اوکاڑہ سے 1949ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1951ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ 1954ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کی۔ 1956ء میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لاہور میں عابد حسن منٹو اور سید افضل حیدر کے ساتھ مل کر کچھ عرصہ وکالت بھی کی۔ میجر اسحاق محمد، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی (پنڈی سازش کیس والے) اور عابد حسن منٹو آپ کے کلاس فیلوز رہے ہیں۔

30 نومبر 1967ء کو گلبرگ لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ پر منعقد ہونے والے اُس تاریخی کنونشن میں شامل تھے جہاں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی اراکین میں شمار ہوتے ہیں۔ 2 دسمبر 1967ء اوکاڑہ میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ پیپلز پارٹی اوکاڑہ کے بانی کنوینر کی حیثیت سے پارٹی کو محلوں کی سطح تک یونٹوں کی شکل میں منظم کیا۔ جس میں ستلج کاٹن ملز کے مزدوروں کا یونٹ بھی شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کے وقت پنجاب کے جن شہروں میں شدید ترین احتجاجی مظاہرے ہوئے ان میں اوکاڑہ شہر سرفہرست ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کے واحد لیڈر ہیں، جنہوں نے پیپلز پارٹی کے پینسٹھ کارکنوں کے ساتھ 1969ء ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والی مزدور کسان کانفرنس میں شرکت کی۔ 1977ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کی طرف سے ایم پی اے منتخب ہوئے۔ 5 جولائی 1977ء کو جب ملک میں مارشل لاء نافذ کیا گیا تو انہیں اوکاڑہ سے گرفتار کر کے راولپنڈی لے جایا گیا، جہاں سمری ملٹری کورٹ نے ایک سال قید بامشقت اور پندرہ کوڑوں کی سزا سنائی۔ کوڑوں کی سزا عمر کی زیادتی کی وجہ سے نہ دی گئی۔ بقیہ قید جہلم اور سنٹرل جیل ساہیوال میں بھگتی۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الحق نے جب مجلس شوریٰ بنائی تو رانا صاحب کو بھی مجلس شوریٰ میں شمولیت کے لیے کہا۔ رانا صاحب نے انکار کر دیا کہ میرے نظریات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ 1982ء میں ایم آر ڈی (تحریک بحالی جمہوریت) میں بطور جنرل سیکرٹری ضلع اوکاڑہ کام کیا۔ 1985ء میں پیپلز پارٹی کی بنیادی رکنیت سے علیحدہ ہو گئے اور عوامی نیشنل پارٹی کی رکنیت اختیار کر لی۔ جہاں وہ مرکزی جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس پیرانہ سالی میں بھی رانا صاحب اپنے آدرش یعنی غیر طبقاتی سماج اور انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

_______ محمد زکریا خان

ISBN: 978-969-9783-01-2
Rs. 250/-





انور سنز پبلشرز ساہیوال
0300-6926533, 0312-4228333
anwersons@gmail.com